DATE LABEL

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو، مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

آیات و نغمات

جوشؔ

مکتبہ اُردو لاہور

۱۹۴۴ء

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکرِ غالبؔ کہ در زمانۂ تُست

فہرست مضامین

بنامِ قوّت و حیات

اِنسان کا ترانہ

مِری شان سے بحر و بر کانپتا ہے
شجر کانپتا ہے حجر کانپتا ہے

مِرے تیشۂ نَو کی جھنکار سُن کر
دلِ سختِ کوہ و کمر کانپتا ہے

مِرے درسِ اخلاقِ نَو کی صدا سے
تنِ "عیب" و جسمِ "ہُنر" کانپتا ہے

مِری شرحِ جبرِ "مشیّت" کے آگے
نہاں خانۂ "خیر" و "شر" کانپتا ہے

مرے دستِ جاں بخش کی دشنگوں سے
حصارِ ہلاکت کا دَر کانپتا ہے
مرے مَرگ بر دوش قہر و غضب سے
دیارِ مسیح و خضر کانپتا ہے
مری نور و ظلمت کی تفسیرِ نَو سے
مُعمّائے شام و سَحر کانپتا ہے
مری فکرِ غوّاص کے تیوروں سے
صَدف مُضطرب ہے، گُہر کانپتا ہے
مری ضربت دستِ گیتی شِکَن سے
جواہر لرزتے ہیں، زر کانپتا ہے
مرے عَزمِ پرواز کے دبدبے سے
دلِ نجم و شمس و قمر کانپتا ہے

مرے ذوقِ تسخیرِ قدرت کے آگے
عناصر کا قلب و جگر کانپتا ہے
مرے تازہ آئینِ فکر و نظر سے
نظامِ قضا و قدر کانپتا ہے
مرے دام سے طائرِ وقتِ اعظم
بہ ایں قوّتِ بال و پر کانپتا ہے
مرے چاک کی نو بہ نو گردشوں سے
دلِ کوزہ کیا، کوزہ گر کانپتا ہے
قسم جوشِ دُنیا کے ہر خشک و تر کی
کہ مجھ سے ہر اِک خشک و تر کانپتا ہے

۸

خار و گُل

اے دوست ، دل میں گردِ کدُورت نہ چاہیئے
اچھّے تو کیا ، بُروں سے بھی نفرت نہ چاہیئے
کہتا ہے کون ، پھُول سے رغبت نہ چاہیئے
کانٹے سے بھی مگر تجھے وحشت نہ چاہیئے

کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہُو سبزہ زار کا
پالا ہُوا ہے وہ بھی نسیمِ بہار کا

خود پرست لیڈر

غلط کہتا ہے، گو وہ شخص جو تجھ سے یہ کہتا ہے
کہ بحرِ ہند کے اَمواج میں گوہر نہیں مِلتا
غلط گو یہ بھی ہے، یعنی وطن کے نفس کے اندر
نظر ییں خیر گی جس سے ہو وہ جَوہر نہیں مِلتا
غلط گو یہ بھی ہے، جس میں جہاں بانی کا سَودا ہو
کسی کے دوش پر اِس مُلک میں وہ سر نہیں مِلتا
غلط گو یہ بھی ہے، یعنی دیارِ ہند کے اندر
کسی میں جذبۂ تیمور و اسکندر نہیں ملتا

غلط گو یہ بھی ہے، ہندوستاں والوں کے سینے میں
دلِ شبّیر و زورِ فاتحِ خیبر نہیں مِلتا
مگر اِس بات سے انکار کی جرأت نہیں ہوتی
کہ اِس خطّے میں ڈھونڈے سے بھی کیرکٹر نہیں مِلتا
اُسی کا یہ نتیجہ ہے کہ پُورے برِّ اعظم میں
جو اپنے کو بُھلا سکتا ہو، وہ لیڈر نہیں مِلتا
اور اُس کا یہ نتیجہ ہے، کہ ہر گوشے میں، ہر گھر میں
"خُدا" تو سیکڑوں ملتے ہیں، "پیغمبر" نہیں مِلتا

برف میں آگ

جوش، اس دورِ خنک میں ناگہاں
آج کیوں لَو دے اُٹھا قلبِ تپاں
آسماں ہے سرد کہرے میں نہاں
اور زمیں پر باد و باراں کا سماں
پھر کہاں سے آئیں یہ چنگاریاں؟

ناز باقی ہے، نہ احساسِ نیاز
کارفرما ہے، دماغِ فتنہ باز
برسرِ غوغا ہے عقلِ حیلہ ساز
اور محبّت، بے خروش و بے زباں
پھر کہاں سے آئیں یہ چنگاریاں؟

سوزِ دل پر چھائی ہے فکرِ حکیم
اب نہ وہ گُلشن، نہ وہ مَوجِ نسیم
وَلولوں کا سَر ہے اور ضربِ "کلیم"
اور فرازِ قلب پر تاریکیاں
پھر کہاں سے آئیں یہ چنگاریاں؟

لُٹ چُکی ہے دولتِ برق و شرار
برف و شبنم پر ہے، لے دے کر مَدار
عقل کی بیداریاں ہیں گرمِ کار
اور جنُوں، وابستۂ خوابِ گراں
پھر کہاں سے آئیں یہ چنگاریاں؟

رُوح پر ہے بے کسی چھائی ہُوئی
آگ ہے سینے کی کجلائی ہوئی
شام پھیکی، صبح مُرجھائی ہوئی
وقت ہے بے نغمہ و بے داستاں
پھر کہاں سے آئیں یہ چنگاریاں؟

دُور ہے، سرِ منزلِ مہرِ مُنیر
دِل میں ہیں پیوست یخ پاروں کے تیر
زمہریر و زمہریر و زمہریر
الاماں و الاماں و الاماں
پھر کہاں سے آئیں یہ چنگاریاں؟

اَبدی شُعلہ

زباں ساکت ہے لیکن تر زبانی اب بھی ہوتی ہے
لبِ خاموش سے جادُو بیانی اب بھی ہوتی ہے
حدیثِ نفس کی صورت میں اکثر خود بخود پہروں
زمانِ کیف کی افسانہ خوانی اب بھی ہوتی ہے
لبِ گُل رنگ کو ہوتی ہے جُنبش جب تصوّر میں
سماعت کی زمیں پر گُل فشانی اب بھی ہوتی ہے
کبھی جب عہدِ رنگینی کی راتیں یاد آتی ہیں
عَروسِ شوق کی پوشاک دھانی اب بھی ہوتی ہے

بہ ایں طغیانِ حکمت، کون مانیگا کہ اِس دل پر
مُسلّط ھے بلائے آسمانی اب بھی ہوتی ہے
رسُولِ شادمانی ہُوں مگر چھڑتے ہیں جب نغمے
نظر سے سوزِ غم کی ترجمانی اب بھی ہوتی ہے
فدائے خندہ ہوں، لیکن جب اُن کی یاد آتی ہے
مِری آنکھوں سے اشکوں کی روانی اب بھی ہوتی ہے
ترانوں سے مری محفل کو گو فرصت نہیں ملتی
مگر تنہائیوں میں نوحہ خوانی اب بھی ہوتی ہے
بہ ایں مشقِ تحمُّل، بارہا خاموش راتوں میں
کسی کی یاد۔ مرگِ ناگہانی اب بھی ہوتی ہے
خِرَد کا دَور ہے، لیکن مرے کم بخت سینے میں
جُنوں کی گاہے گاہے پَر فشانی اب بھی ہوتی ہے

کسی کے رُوئے رنگیں کی صباحت کے تصوّر میں
چمن کی چاندنی اکثر سُہانی اب بھی ہوتی ہے
وفورِ یاس سے گو دِل رہینِ برف و شبنم ہے
کبھی پچھلے پہر آتش فشانی اب بھی ہوتی ہے
نہ جانے جوشؔ کس ارماں میں اب تک جان باقی ہے
کہ اکثر آرزوئے زندگانی اب بھی ہوتی ہے

بے مہرِ مشیّت

خدا گواہ کہ منشا ہے یہ مشیّت کا
کہ قلبِ آدمِ خاکی سدا فگار رہے
ہر ایک بوسۂ شیریں کا مُدّعا یہ ہے
کہ داغ بن کے کلیجے پہ یادگار رہے
ہر اک پیامِ تجلّی سے ہے یہی مقصود
کہ نسلِ آدم و حوّا سیاہ کار رہے
فقط یہ علّتِ غائی ہے رسمِ درماں کی
کہ دِل میں درد کی بُنیاد اُستوار رہے

بس ایک بار میسّر ہوں نُقرئی باڑہیں
تمام عُمر گرفتارِ صد فشار رہے
جو ایک سال بھی شاداں رہے یہ خُفتہ نصیب
ہزار سال دل افگار و بیقرار رہے
جو ایک بار بھی بشّاش ہو یہ سوختہ جاں
تو لاکھ بار پریشان و اشکبار رہے
ہُجومِ عیش کے آغوش میں بھی یہ بدبخت
شکستہ خاطر و محزون و سوگوار رہے
گلُوں سے کھیل کے بھی خار سے نہ ہو فارغ
چمن میں رہ کے بھی بیگانۂ بہار رہے
مگر حکیم وُہی ہے جو اِن شدائد میں
ہمیشہ فاتحِ غم ہائے روزگار رہے

بہ فیضِ فکر، علی الرّغم قدرتِ جابر
شگفتہ باطن و رنگین و تابدار رہے
ہر اک قدم پہ بغاوت کرے مشیّت سے
سدا خزاں کے مقابل سدا بہار رہے
ہجومِ کاوشِ ہستی میں جوشؔ کے مانند
ترانہ سنج و نظر باز و بادہ خوار رہے

نیا میلاد

اب سے تقریباً پچھتّر سال پہلے ہمنشیں
مُبتلا تھی سخت تشویش و تذبذب میں زمیں
دَہر کا بُوڑھا تمدّن مل چکا تھا خاک میں
اور جواں دستُور گُم تھا محبسِ اِدراک میں
خاک پر رکھّی ہوئی تھی کُہنہ قدروں کی جبیں
اور نئی قدریں تھیں قصرِ ذہن میں خلوت نشیں
خستہ جاں تہذیب، آثارِ جاں چکی تھی قبر میں
اور نئی تہذیب، مُضمَر تھی حجابِ اَبر میں

پُشت پر ٹوٹی پڑی تھیں کچھ پُرانی سیڑھیاں
اور آگے کوئی رہبر تھا، نہ کوئی نردباں
دین کے دھارے کے اندر بجلیوں کی رَو نہ تھی
اَور بے دینی میں شفّاف و نُمایاں ضَو نہ تھی
ہو چکا تھا پُوچ و مُہمل حرفِ آئینِ قدیم
اَور جدید اخلاق تھا زیرِ حجاباتِ عظیم
بے ضیا، پیغمبری تھی، کافری تاریک تر
کس غضب کی کشمکش تھی، کس بلا کا انتشار
بن چکا تھا، نظمِ امروز ایک برقِ امن سوز
اور تھا دستورِ فردا کارخانے میں ہنوز
گُھنگی بے رُوح تھی، اَور جدّتیں بے برگ و بار
وہ اُدھر مجبُور تھی، اَور یہ اِدھر بے اختیار

وُہ ترازُو ، تولتی تھی جو حقائق کو کبھی
وقت کے گھن سے پڑی تھی خاک پر ٹوٹی ہوئی
عالمِ ماضی ، بطونِ گور کی پستی میں تھا
عالمِ آئندہ ، بطنِ شاہدِ ہستی میں تھا
نسلِ انسانی کھڑی تھی ششدر و آتش بجاں
اِک عبوری موڑ پر ۔ دو عالموں کے درمیاں
کُہنہ عالم میں حیات آمیز رقص و رم نہ تھا
جلد پیدا ہو ، نئے عالم میں اِتنا دم نہ تھا

آج لیکن عصرِ حاضر کا سماں کچھ اَور ہے
اب زمیں کچھ اَور ہے اب آسماں کچھ اَور ہے

ہاں وُہی عالم کہ تھا مدّت سے جس کا اشتیاق
آج پیدا ہو رہا ہے با ہزاراں طمطراق
جن کو یہ ڈر ہے کہ یہ مَولُود ہوگا نا سعید
اُن کے اَوجِ ذہن پر ہے پَرتوِ وہمِ شدید
اَور جو کہتے ہیں جہاں زیر و زبَر ہونے کو ہے
کہدو، چُپ ہو جائیں اِک جشنِ دِگر ہونے کو ہے
آج جو چھایا ہُوا ہے زندگی پر یہ دھُواں
اِس دُھوئیں میں پر فشاں ہیں سیکڑوں رنگینیاں
اِس شبِ جامد میں، صبحِ سَیلِ احساسات ہے
اب بھی مانا رات ہے، لیکن یہ پچھلی رات ہے
شب کے اِس دُھندلے اُفق سے با ہزاراں آب و تاب
اَمن و آسائش کا طالع ہو رہا ہے آفتاب

تیز تلواروں سے ہو کیوں عصرِ نو چیں بر جبیں
یہ تو اِس موسم کے پھل ہیں، تیز تلواریں نہیں
اِن پھلوں کو آدمی چکھ کر اَمَر ہو جائے گا
آفتابِ حُبِّ انساں جلوہ گر ہو جائے گا
اِک انوکھی ضَو سے دُنیا جگمگا دی جائے گی
شمع، برتر آدمیّت کی جلا دی جائے گی
کہہ رہا ہے صاف لفظوں میں زمیں کا خلفشار
دَردِ زِہ میں مبتلا ہے، مادرِ لیل و نہار
ہل رہا ہے یہ جو توپوں کی گرج سے آسماں
یہ تو ہے دراصل وضعِ حمل کی آہ و فغاں
جس کو ہے اسقاط کا اندیشہ وہ دیوانہ ہے
یہ حضورِ ارتقا، اِک حرفِ گستاخانہ ہے

جنگ کی بھٹّی سے آنے ہی پہ ہے بادِ مُراد
ارتقا، پائندہ باد و نوعِ انساں زندہ باد
آ چکی ہے نقطۂ تکمیل پر حیوانیت
دیکھ، پیدا ہو رہی ہے اِک جدید انسانیت
پرتوِ تائید ہے اِس پردۂ تردید میں
ایک صالح زندگی ہے معرضِ تولید میں
آ رہا ہے تازہ وارث، عالمِ ایجاد کا
جلد تر اعلان کر دو اِک نئے میلاد کا

باغیِ انسان

حکمراں آج بھی ہے پیرِ مُغاں کیا کہنا
وُہی دفتر ہے، وُہی مُہرِ و نشاں کیا کہنا
عقل کی تند ہوائیں ہیں خِرد شاں کب سے
پھر بھی ہے شمعِ جنوں شُعلہ فشاں کیا کہنا
کب سے تقویٰ ہے مزامیر و ترنّم کے خلاف
آج بھی نغمہ ہے آشوبِ جہاں کیا کہنا
کب سے خورشید کی حدّت میں ہے فرمانِ سکوت
پھر بھی جنبش میں ہے ذرّوں کی زباں کیا کہنا
ذرّے ذرّے پہ جہنّم کی لگی ہیں مُہریں
پھر بھی دُنیا پہ ہے جنّت کا گُماں کیا کہنا

کب سے ادیان کی خشکی میں ہے تبلیغِ سَراب
وُہی رونق ہے سرِ آبِ رواں کیا کہنا
عقل کے دَور میں بھی عشق نہیں ہے خاموش
وُہی نالے ہیں، وُہی شورِ فغاں کیا کہنا
کب سے ہے ذَوقِ نظر، حکمِ شریعت سے حرام
وُہی نظریں ہیں، وُہی حسنِ جواں کیا کہنا
آج بھی جلوہ، رنگیں کی طلبگاری میں
چشمِ اِنساں ہے بہرِ سُو نِگراں کیا کہنا
ہاں بہ ایں شدّتِ آیات و احادیثِ حجاب
دستِ خوباں میں ہے شوخی کی عناں کیا کہنا
شبنم و بَرف کے اِس حلقۂ نمناک میں بھی
اُٹھ رہا ہے دلِ انساں سے دھُواں کیا کہنا
لرزش ہیں منبر و محراب کے لہجے کب سے
پھر بھی سرشار ہیں رندانِ جہاں کیا کہنا

زُہد کے کوُئے ہلاکت میں بھی ہیں گرمِ خرام
زُلف بر دوش مسیحا نفساں کیا کہنا
کب سے قرنوں کا ہے شانوں پہ اُٹھائے ہوئے بار
پھر بھی رقصاں ہے جہانِ گُزراں کیا کہنا
سینۂ دہر ہے گو تیرِ حوادث سے فگار
پھر بھی ابرو کی لچکتی ہے کماں کیا کہنا
کب سے ہے نُطقِ رسالت پہ رواں ہجوِ شراب
وہی ہلچل ہے سرِ کوُئے مغاں کیا کہنا
لِللہ الحمد کہ خودِ حُکمِ "خُدا" کے باوصف
ہے وُہی گرمیٔ بازارِ بُتاں کیا کہنا
آفریں باد کہ اِس جبرِ مشیّت پہ بھی ہے
دستِ انساں میں بغاوت کی عناں کیا کہنا

باغی رُوحوں کا کورس

تضمین بر

"باغیِ انسان"

(۱)

مُعتبر آج بھی ہے، رطلِ گراں کیا کہنا
اب بھی مُستقل ہے بہ ازبانگِ اذاں کیا کہنا
قبضۂ بادہ میں ہے رُوحِ جہاں کیا کہنا
حکمراں آج بھی ہے پیرِ مُغاں کیا کہنا
وُہی دفتر ہے، وُہی مہر و نشاں کیا کہنا

(۲)

برسرِ فتنہ ہے ایمان کا طوفاں کب سے
آندھیاں جنّت و دوزخ کی ہیں غلطاں کب سے
مُرغِ دانش ہے سرِ عرش پَر افشاں کب سے
عقل کی تُند ہوائیں ہیں خروشاں کب سے
پھر بھی ہے شمعِ جنُوں شُعلہ فشاں کیا کہن

(۳)

کب سے آنسو ہے طربناک تبسّم کے خِلاف
کب سے لُکنت ہے شکر ریزیٔ تکلّم کے خِلاف
کب سے تمکین ہے آئینِ تلاطُم کے خِلاف
کب سے قِرأت ہے مزامیر و ترنّم کے خِلاف
آج بھی نغمہ ہے آشوبِ جہاں کیا کہ

(۴)

کب سے ہے پنجۂ تبلیغ میں دامانِ سکوت
کب سے بے نغمۂ شریعت ہے ثناخوانِ سکوت
کب سے ہے سجدہ و تسبیح میں طغیانِ سکوت
کب سے خورشید کی حدّت میں ہے فرمانِ سکوت
پھر بھی جنبش میں ہے ذرّوں کی زباں کیا کہنا

(۵)

خاک پر نوحۂ پیہم کی لگی ہیں مُہریں
زیست پر دیدۂ پُرنم کی لگی ہیں مُہریں
دفترِ عیش پہ بھی غم کی لگی ہیں مُہریں
ذرّے ذرّے پہ جہنّم کی لگی ہیں مُہریں
پھر بھی دُنیا پہ ہے جنّت کا گُماں کیا کہنا

(۶)

کَب سے ذہنوں پہ ہیں پارینۂ عقائد کے حجاب
کَب سے انسان پر اَوہام کا نازل ہے عذاب
کَب سے قُدرت کے صحیفے پہ مُسلّط ہے کتاب
کَب سے اَدیان کی خشکی میں ہے تبلیغِ سَراب
وُہی رونق ہے سرِ آبِ رواں کیا کہنا

(۷)

دِل، اگر دُوزخِ پہلُو ہے تو سَر آتشِ دوش
وُہی نالوں کی گرَج ہے، وُہی آہوں کا خروش
جَلوہ۔ آشفتگیٔ چشم ہے، لَے۔ آفتِ گوش
عقل کے دَور میں بھی عِشق نہیں ہے خاموش
وُہی نالے ہیں، وُہی شورِ فغاں کیا کہنا

(۸)

کب سے نازِل ہے حقائق پہ بَلائے اَوہام
ذہنِ نازک جنّت میں ہے دوزخ کی لگام
کب سے فطرت کے جگر میں ہے خراشِ اِلہام
کب سے ہے ذوقِ نظر حُکمِ شَریعت سے حرام
وُہی نظریں ہیں، وُہی حُسنِ جواں، کیا کہنا

(۹)

آج بھی کاوشِ اَفسُون وفسُوں کاری ہیں
آج بھی کاہشِ بدمستی و سرشاری ہیں
آج بھی ولولۂ شوخی و طرّاری ہیں
آج بھی جلوۂ رنگیں کی طلب گاری ہیں
چشمِ انساں ہے بہر سُو نگراں، کیا کہنا

(۱۰)

دین میں عشوۂ بے باک ہے شایانِ عذاب
غمزۂ و نازہ پر اِک عمر سے ہے چشمِ عتاب
دستِ ہمّت شکنی میں ہے سرِ زُلفِ شباب
پر بہ ایں شِدّتِ آیات و احادیثِ حجاب
دستِ خوباں میں ہے عشوؤں کی عناں، کیا کہنا

(۱۱)

رُوح کے یخ کدۂ عالمِ افلاک میں بھی
وہمِ فردوس کے ٹھنڈے خس و خاشاک میں بھی
فِقہ کی سردو خنک انجمنِ "پاک" میں بھی
شبنم و برف کے اِس حلقۂ نمناک میں بھی
اُٹھ رہا ہے دلِ انساں سے دُھواں، کیا کہنا

(۱۲)

بند ہیں حرف و حکایت کے دریچے کب سے
تلخ ہیں برہمن و شیخ کے فقرے کب سے
تند ہیں اہلِ مناجات کے خطبے کب سے
ترش ہیں منبر و محراب کے لہجے کب سے
پھر بھی سرشار ہیں رندانِ جہاں کیا کہنا

(۱۳)

نغمہ و زمزمہ و جلوہ و شعر و مے و جام
وا دریغا کہ ہے ان میں سے ہر اک چیز حرام
خنجرِ زہد کی ُبرّش سے بپا ہے کہرام
لیکن اس کوئے ہلاکت میں بھی ہیں گرمِ خرام
زلفِ بر دوش مسیحا نفساں ، کیا کہنا

(۱۴)

آفریں باد بر ایں ہمّتِ کونینِ شکار
نہ تو شکوے ہی سے واقف، نہ شکایت سے دوچار
نشّۂ عہدِ جوانی کا ہے ہر چند اُتار
اُس پہ قرنوں کا ہے شانوں پہ اُٹھائے ہوئے بار
پھر بھی رقصاں ہے جہانِ گزراں، کیا کہنا

(۱۵)

شاہدِ ارض ہے گو جورِ فلک سے بیزار
حلق پر خنجرِ خوں ریز ہے سَر پر تلوار
زُلف پر گردِ مہ و سال ہے، چہرے پر غبار
دلِ نازک بھی ہے گو وقت کے تیروں سے فگار
پھر بھی ابرو کی لچکتی ہے کماں، کیا کہنا

(۱۶)

کب سے تقوے کی حمایت میں ہے شمشیر و کتاب
کب سے شورش ہے کہ دَب جائے اذانوں سے رَباب
کب سے رندوں کے تعاقب میں ہیں آیاتِ عذاب
کب سے ہے نطقِ رسالت پہ رَواں ہجوِ شراب
وُہی ہلچل ہے سرِ کُوئے مُغاں، کیا کہنا

(۱۷)

لِللّٰہ الحمد کہ سَعیِ فُقَہار کے باوصف
لِللّٰہ الحمد کہ جہدِ صُلَحا کے باوصف
لِللّٰہ الحمد کہ خُونِ شُہَدا کے باوصف
لِللّٰہ الحمد کہ خود حُکمِ خدا کے باوصف
ہے وُہی گرمیٔ بازارِ بُتاں، کیا کہنا!

(۱۸)

آفریں باد کہ اِس جبرِ شریعت پہ بھی ہے
آفریں باد کہ اِس رُعبِ نبُوّت پہ بھی ہے
آفریں باد کہ اِس خوفِ عقُوبت پہ بھی ہے
آفریں باد کہ اِس دعوتِ جنّت پہ بھی ہے
دستِ انساں میں بغاوت کی عناں، کیا کہنا

مُحبّت کا اعجاز

اب دید کی حسرت کا وہ انداز نہیں ہے
پرواز بجُز حسرتِ پرواز نہیں ہے
یہ ہجر مُسلسل ہے کہ یہ تلخیٔ انجام
اَب رُوح میں وہ آتشِ آغاز نہیں ہے
آشفتگیٔ ہیبتِ شاہینِ خرد سے
اَب مُرغِ جنوں زمزمہ پرداز نہیں ہے
اللہ ری افسردگیٔ شوقِ حکایت
اَب آرزوئے خلوتی راز نہیں ہے

کل جس سے رگ و پے میں خروشاں تھا تلاطم
گونجی ہوئی اب دل میں وہ آواز نہیں ہے
با ایں ہمہ بجلی سی چمک جاتی ہے اب بھی
کیا ہے؟ جو محبت کا یہ اعجاز نہیں ہے

نگاہِ خلوص میں

نہ پُوچھ ذوقِ سفر کو میرے، کہ اکثر اِس بزمِ آب و گِل میں
کبھی بیابانِ غم میں پہنچا، کبھی شبستانِ جسم کو دیکھا

کبھی برہمن کا رُوپ بھر کر، کبھی حق آگاہ شیخ بن کر
ضیائے شمع و حرم کو جا پہنچا، فروغِ بیت الصنم کو دیکھا

کبھی تفکّر کی روشنی میں، فلک کو کھولا، زمیں کو پلٹا
کبھی صحافت کے آئینے میں، عرب کو پرکھا، عجم کو دیکھا

کبھی لیا درسِ زندگانی، کبھی سُنی موت کی کہانی
کبھی کتابِ وجود کھولی، کبھی نصابِ عدم کو دیکھا

کبھی حوادث کے عُقدہ ہائے فساد انگیز پر نظر کی
کبھی زمانے کی کاکلوں کے جنوں فزا پیچ و خم کو دیکھا
کبھی دماغِ گرہ کُشا نے، اساسِ علم و عمل کو تولا
کبھی نگاہِ کرشمہ بیں نے، بطونِ دیر و حرم کو دیکھا
کبھی جنوں خیز جھٹپٹے میں، ترنّمِ آہِ پُر فغاں کی
کبھی طلوعِ سحر کی رَو میں، تبسّمِ چشمِ نم کو دیکھا
کبھی طرب میں نگہ اُٹھا کر، کبھی تفکّر میں سر جھکا کر
فلک کی رفعت نظر میں تولی، زمیں کے جاہ و حشم کو دیکھا
کبھی تمدّن کے فرشِ گُل پر، ٹھہر کے وحشت کی لگاوٹ
کبھی مصیبت کے راستے سے، پلٹ کے ناز و نعم کو دیکھا
کبھی یمِ بیکراں کے اندر، فقط ملا اِک حقیر قطرہ
کبھی ہر اک قطرۂ تنک میں، خروشِ صد موجِ یم کو دیکھا

کبھی کُلاہِ شہنشہی میں نظر پڑا کاسۂ گدائی
کبھی سَرِ کاسۂ گدائی، شکوہ و طبل و علم کو دیکھا
کبھی لگا تارِ ارتقا کی تلاشِ پیہم کے سلسلے میں
سُراغِ جہل و جنوں لگایا، بنائے سیف و قلم کو دیکھا
کبھی عداوت کے حامِلوں کی، ہر ایک ادا پر نگاہ ڈالی
کبھی محبت کے رہرووں کے، ہر اِک نقشِ قدم کو دیکھا
خلاصہ اس گفتگو کا یہ ہے، کہ اس پراگندہ زندگی میں
خیالِ ہر خیر و شر میں ڈوبا، مآلِ ہر بیش و کم کو دیکھا
مگر مجھے یہ بڑی خوشی ہے، کہ اِس تماشائے نَو بہ نَو میں
مری نگاہِ خلوص بیں نے، "دیا نرائن نگم" کو دیکھا

رذالت کی خدمت میں اپیل

(۱)

جوہرِ انسانیت ہے زندگی کے حق میں سم
اَلاماں و اَلحذر، اخلاق کا جور و ستم
اے رذالت، تجھ کو اپنی سرفرازی کی قسم
اِس طرف بھی ایک لمحے کے لئے چشمِ کرم

دیکھ، اِک دُنیا ہوئی جاتی ہے دُشمن، چھوڑ دے
میرا دامن، اے شرافت، میرا دامن چھوڑ دے

(۲)

خدمتِ یارانِ بے کس اِک قیامت ہو گئی
دوستوں کی دستگیری، وجہِ کُلفت ہو گئی
سخت حیراں ہُوں، یہ کیا دُنیا کی حالت ہو گئی
جِس پر احساں کر دیا، اُس کو عداوت ہو گئی

تجھ سے اے دل، پھر بھی عادت خیر کی جاتی نہیں
بے حیا، ذوقِ کرم سے اب بھی شرم آتی نہیں

(۴۲)

دُشمنِ خُلق و مُروّت ہے نظامِ کائنات
خُود کُشی ہیں خُود کُشی، ادیان کے نادِر نِکات
زَرد ہے بیماریٔ اخلاص سے رُوئے حیات
اے رِیا کاری! اِدھر بھی اک نگاہِ التفات

ہے شرافت، زہر، جانِ مُبتلا کے واسطے
اے رذالت، دستگیری کر خدا کے واسطے

(۴)

نوعِ انساں حیلہ جُو ہے، اور "خدا" ہے بے نیاز

اِز تکابِ قتل ہے پابندیٔ سوز و گداز

ابنِ آدم، اور اُٹھائے راست گفتاری کے ناز!!

نُطق پر ہو جا مُسلّط اے دروغِ کارساز!

زندگی بے چین ہے حاجت روائی کے لئے

آ خدارا کذب آ مشکل کشائی کے لئے

ماضی کا گودام

حافظے! یہ تو کہاں لایا ہے مجھ کو وقتِ شام!
یہ تو ہے بے درد، عبرت ناک ماضی کا گودام
اُف یہ حُجرہ کتنا غم افزا ہے، کتنا تنگ و تار
پُر فشاں ہے جس پہ ماہ و سال کا دُھندلا غبار

ہاں، یہ ہیں میرے لڑکپن کی قدیم الماریاں
جن کی ٹھنڈی گرد پر قربان سو گُلکاریاں

جن کے تختے ہیں تلاطُم کا مزا چکھے ہُوئے
شورشِ طفلی کے دفتر جن میں ہیں رکھے ہُوئے
ہو رہی ہے اِن کے آئینوں سے ابتک آشکار
ماں کی شفقت، باپ کی جاں پروری، دادی کا پیار
اور یہ رکھے ہوئے ہیں اک طلائی طشت میں
گَرد آلُودہ تماشے، اَشک آلودہ عِیدیں
اور اُنہیں کے ساتھ لٹّو، گیند، باجے، تھاپیاں
مکتبوں کی تختیوں پر مَدرسوں کی کاپیاں
اور اُنہیں کے پاس اِک جانب، بصد حالِ تباہ
کان کا سونے کا دُر، اور سَر کی جبریلی کلاہ

.. ..

.. ..

اور یہ الماریاں، غلطاں ہیں جن میں آفتاب
اِن میں ہے رقصندہ میرا سازو سامانِ شباب
اشتیاق آمیز تحریریں، ملاقاتوں کے کارڈ
عہدِ رنگینی کی فلمیں، مُطربِ دل کے ریکارڈ
مُنہ اندھیرے کی اُمنگیں، چاندنی کے ولولے
تہ کئے رکھے ہوئے ہیں، گرد میں لپٹے ہوئے
آج تک محفوظ ہے اُس دور کی ہر شے یہاں
قہقہے، آنسو، تبسّم، راگ، آہیں، سسکیاں
حُسن کے لب کا تبسّم، عشق کے دِل کی ترنگ
میرے ماتھے کا پسینہ، اُن کے رخساروں کا رنگ
نُقرئی بانہوں کا مَس، رنگین افسانوں کا رس
ہیچ ہے سب ہیچ ہے ——— اللہ بس، باقی ہوس!

مُحبّت کی قہرمانی

اللہ ری قہرمانِ محبّت کی سختیاں
خود داریوں کی زُلف کا ہر بَل نِکل گیا
ہاں وہ غُرور، عِشق کے ناموس کا غرُور
افسوس، ننگ و عجز کے سانچے میں ڈھل گیا
جن رِفعتوں کے سامنے جُھکتی تھی کائنات
اُن رِفعتوں کا شب کو جنازہ نِکل گیا
اِس ہولناک رُوح فروشی کے باوجُود
یہ بھی نہیں ہُوا کہ بُرا وقت ٹل گیا
"اُس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا، کِیا ذلیل
مَیں کُوچۂ رقیب میں بھی سَر کے بَل گیا"

حادثے

وائے بر تقدیرِ آدم، وائے بر لیل و نہار
بزمِ عشرت بھی ہے خونی حادثوں کی راہ گزار
کچھ تو ناقص حادثے ہیں کچھ مکمّل حادثے
زندگی میں حادثے ہیں، اور مسلسل حادثے
سنگِ خارا کے مساکن ہوں کہ آہن کے دیار
حادثوں کے واسطے ہیں آبگینوں کے حصار
گاہ اُترتے ہیں یہاں عرشِ بریں سے حادثے
گاہ اُبل پڑتے ہیں خود فرشِ زمیں سے حادثے

دامنِ کہسار میں چلتی ہے جب بادِ شمال
حادثے اُس وقت بھی ہوتے ہیں مصروفِ قتال
جام میں ہوتا ہے جب پرتو فگن ماہِ مُنیر
حادثے کے اُس سُہانے وقت بھی چلتے ہیں تیر
جب ہوائیں گُنگُنا اُٹھتی ہیں، اور کھِلتے ہیں پھُول
اُن مواقع پر بھی ہوتا ہے حوادِث کا نزُول
کُچھ محرّم ہی نہیں ہے منزلِ شمر و یزید
ڈُوب سکتی ہے لہُو کی سُرخیوں میں صُبحِ عید
دِل کو وقتِ خواب بھی بیدار رہنا چاہیئے
حادثوں کے واسطے تیّار رہنا چاہیئے

تُو اگر واپس نہ آتی

(۱)

تُو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے
حشر کے دِن تک دُھواں اُٹھتا بطُونِ خاک سے
ہات آجاتا اگر تیرا نہ میرے ہات میں
دِل پہ کیا کُچھ بیت جاتی اُس اندھیری رات میں
اُف وہ طوفاں، وہ بھیانک تیرگی، وہ ابر و باد
وہ ہوائے تُندِ باراں، وہ خروشِ برق و رعد[1]
دفعتہً وہ روشنی کے سِلسلے کا ٹُوٹنا
وہ گھٹاؤں کی گرج سے نبضِ ساحل چھُوٹنا

---

[1] "باد" اور "رعد" کا قافیہ میرے نزدیک دُرست ہے ۔

وُہ ”اَپالو“ کے کلیجے کی مچلتی ”مان سُون“
وہ سمندر کے تھپیڑے، وُہ ہواؤں کا جنُون
اَور اُس طوفان میں اے زندگی کی رُوشنی
کُود پڑنا وہ سمندر میں ترا یکبارگی

(۲)

تُو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے
حشر کے دِن تک دُھواں اُٹھتا بطُونِ خاک سے
اِس دِلِ سوزاں میں آتے اِس بلا کے زلزلے
آسماں روتا، زمیں ہلتی، ستارے کانپتے
مَوت، اور پھر موت تیری، الحفیظ و الاماں
ہڈّیوں سے آنچ اُٹھتی، اور بالوں سے دُھواں

(۳)

لیکن اک لمحے کے بعد اے پیکرِ حُسن و حیات
جوشؔ کو بھی کاوشِ ہستی سے مِل جاتی نجات
پہلے ہوتا اِک تلاطم، ایک طوفاں، ایک جوش
بعد ازاں تُو اور میں، اور بحر و باراں کا خروش
اِنفصالِ رُوح ہوتا مَوت کے گرداب میں
آتشِ غم سرد ہو جاتی کنارِ آب میں

(۴)

بحر کے سینے کو جب طوفان میں لاتی ہوا
پے بہ پے آتی ہمارے گنگنانے کی صدا
جب گھٹائیں رقص کرتیں، اور پپیہے کُوکتے
نُور میں لپٹے ہوئے دونوں اُبھرتے بحر سے

رات جب کچھ بھیگ جاتی، اور جھک جاتا قمر
سیر کرتے روز ہم بانہیں گلوں میں ڈال کر

کوئلیں جب کوکنے لگتیں اندھیری رات میں
صبح تک دھومیں مچاتے ہم بھری برسات میں

چھیڑتا جب کوئی ساحل پر ہماری داستاں
پڑنے لگتیں بحر پر دھندلی سی دو پرچھائیاں

زندہ رہتے حشر تک غم کے پرستاروں میں ہم
سانس لیتے سازِ حُسن و عشق کے تاروں میں ہم

وقف ہو جاتے محبّت کے فسانے کے لئے
سرد ہو کر آگ بن جاتے زمانے کے لئے

نیا امرت [۱]

زبانِ وید کہتی ہے کہ طُوفانی سمندر سے
جَلال انگیز دیوتاؤں نے سات امرت نکالے تھے
وہ اَمرت، جن کے اندر رَو ہے انفاسِ مسیحا کی
وہ امرت، جوت سے جنکی جبیں روشن ہے دُنیا کی
سمندر سے مگر شاعر نے وہ "امرت" نکالا ہے
جبینِ کبریا پر جس کے پَرتو سے اُجالا ہے

---

[۱] ایک حادثۂ خاص کی طرف اشارہ ہے جو بمبئی میں ۱۴- جون ۱۹۳۸ء کی رات کو واقع ہوا تھا

فاتحِ بجر کی خدمت میں

بارگاہِ دلبری میں کوئی پہنچا دو یہ بات
اے کہ تیرے دم سے ہے وابستہ شاعر کی حیات
تیرے پَرتو سے مُنوّر ہے دیارِ شاعری
جوش کے حق میں ہے تو پروردگارِ شاعری
اے کہ تو پاکیزہ تر ہے جُملہ مخلوقات سے
عشق ہے، اور عشقِ کامل، مجھ کو تیری ذات سے
عشق۔ عورت مَرد کا؟ یہ بات ہو سکتی نہیں
عشق۔ شوہر، باپ، بیٹے، بھائی کا؟ یہ بھی نہیں
سوچتا ہوں لاکھ، لیکن لب پہ لا سکتا نہیں
مجھ کو کیسا عشق ہے، خود میں بتا سکتا نہیں

تو سمجھتی ہے میں غش ہوں تیرے آب و رنگ پر
جی نہیں سکتا ہوں میں ایسے مقامِ ننگ پر
قلب آلودہ نہیں جسمانیت کے زنگ سے
رُوح بالا ہو چکی ہے سطحِ آب و رنگ سے
ہاں میں تجھ سے دُور رہ کر، زندہ رہ سکتا نہیں
قُرب سے کیا مُدّعا ہے، یہ بھی کہہ سکتا نہیں
تیرہ دل فتنے اُٹھاتے ہیں، اُٹھانے دے انہیں
اہلِ شر، باتیں بناتے ہیں، بنانے دے اُنہیں
قُلزمِ عفت ہے تُو، سر چشمۂ عصمت ہے تُو
وید کا اشلوک ہے، قرآن کی آیت ہے تُو
تجھ کو "عصمت کیش" کہہ کر اے غرورِ کردگار
درحقیقت میں نے عصمت کا بڑھایا ہے وقار

آہ، اے بنتِ حیا، اے دُخترِ پاکیزگی
جہل سے مَیں نے سمجھ رکھا تھا تجھکو آدمی
آدمی ہوتا ہے ظَالِم، بے مُروّت، زِشت خُو
بے وفا، بے مہر، خودسر، بے حیا، بے آبرو
آدمی بدعَہد ہے، بدخُو ہے، بے آئین ہے
آدمی کہنا تجھے، تیری کُھلی تَوہین ہے
ہاں "اَپالو" پر یہ ثابت کر کے چھوڑی تُو نے بات
یعنی اِس دُنیا میں ہے معصُوم اگر کوئی حیات
وہ تو کیا، اِک رونگٹا بھی اُس کا مرسکتا نہیں
اُس کو دریا کیا، سمندر غرق کر سکتا نہیں
ہاں تو اے پاکیزہ دیوی، چشمۂ صدق وصفا
تجھ کو اپنے برہمن کی زندگی کا واسطا

اپنی اُس سوگند، اُس اقرار کا رکھنا خیال
جس کے ہر اک لفظ سے میرا بندھا ہے بال بال
لیکن اَے جانِ صداقت تجھ سے، اور میں بدگماں
جھوٹ سے آلودہ ہو سکتی نہیں تیری زباں
توبہ، توبہ، شک کروں میں، اور تیری بات پر
تُف مری اوقات پر، لعنت ہے میری ذات پر
ہاں جو شک آیا تھا دل میں ایک لمحے کے لئے
سجدہ ہائے سہو کرتا ہوں مَیں اُس کے واسطے
دل کی کمزوری سے ہو جاتے ہیں پیدا وسوسے
بخش دے، اپنے غلامِ کمتریں کو بخش دے
بخش دے اِس بدگمانی کو، مِرے سَر کی قسم
درگزر فرما " اپالو " کے سمندر کی قسم

نذرانۂ اشک

سیٹی نہ دے، کہ قلب مرا چُور چُور ہے
اے ریل، رحم کر، یہ وُہی "ڈھول پور" ہے
جس کی ہوا میں نکہتِ زُلفِ نگار تھی
کل جس پہ "رُوپ سنگھ" کے دَم سے بہار تھی
گُل بار بدلیاں ہیں، نہ زرتار دُھوپ ہے
اَب اِس زمیں پہ رنگ ہی باقی، نہ رُوپ ہے
وُہ چرخ "ڈھول پور" کا تارا نہیں رہا
اِس انجمن کا انجمن آرا نہیں رہا

بزمِ سُرور و کیف، درخشاں نہیں رہی
اِک شمع تھی، سو وہ بھی فروزاں نہیں رہی
وُہ نوجوانیوں کے تلاطم نہیں رہے
وُہ شکّریں لبوں کے تبسّم نہیں رہے
عِشرت کدے کا نام بھی باقی نہیں رہا
مَے خانہ ہے اُداس کہ ساقی نہیں رہا

دریا کے وَلولوں میں جوانی نہیں رہی
"چمبل" کی کشتیوں میں رَوانی نہیں رہی
کلیاں طرب کی، پھُول بنیں، اور بکھر گئیں
وہ دِن ہُوئے تمام، وہ راتیں گزر گئیں
اَب کیا ملے گا آم کے باغوں میں جھُول کر
اے دھول پور، جوؔش کے آنسو قبول کر

خالی بوتل

ٹیس سی اِک ہو رہی ہے قلبِ حق آگاہ میں
کیا بتاؤں ہم نشیں، کیا شے پڑی ہے راہ میں
کیوں نہ چھا جائے دھُواں سا مطلعِ ادراک پہ
بادۂ رنگیں کی بوتل، اور ٹھنڈی خاک پر
آہ اے خاموش دیوی، شب کو تیرے سامنے
کتنے رنگیں راگ ہوں گے، کتنے شیریں قہقہے
جلوہ گر ہوگی نہ جانے کس بہشتِ اوج میں
بہ رہی ہوگی ہزاروں زمزموں کی موج میں

اے طلسمِ نغمہ و افسونِ کیفِ زندگی
اے حبابِ آبگینہ، اے سحابِ سرخوشی
اے حصارِ عافیت، اے گنبدِ رقص و غنا
اے حریمِ سر بہ مُہر، اے معبدِ صدق و صفا
مجھ سے بڑھ کر کون کر سکتا ہے تیرا احترام
مَیں کہ ہوں اس وقت مینائی شریعت کا امام
تجھ میں شب کو، جب کہ حُسنِ بوستاں دہ چند تھا
دُختِ رز کی نوجوانی کا تموّج بند تھا
حیف اے قصرِ بلوریں، تجھ پہ، اور گرد و غبار
جس میں کل تک معتکف تھی دُخترِ ابرِ بہار
شب کہ محفل میں تری شورِ رباب و چنگ تھا
راستی تھی، راگنی تھی، روشنی تھی، رنگ تھا

جذب ہیں سینے میں تیرے گرمیاں نغمات کی
دِل میں تیرے سو رہی ہیں کتنی دُھومیں رات کی
کل تری ہر بُوند تھی، اے خالقِ شعر و شباب
ماہتاب، اندر عنان و آفتاب، اندر رکاب
گُم ہے تیرے جوہروں میں کتنے سینوں کی اُمنگ
تجھ میں غلطیدہ ہے کتنی نرگسی آنکھوں کا رنگ
تجھ میں محوِ خواب ہے، اے چشمۂ باغِ اِرم
کتنے برگِ لالہ سے تر شے ہوئے ہونٹوں کا خَم
تجھ پہ ہوگی رات کو کس ناز سے چھٹکی ہوئی
کتنے افسوں خیز مُکھڑوں کی گُلابی چاندنی
اور آج انداز و افسون و ادا کچھ بھی نہیں
ایک عبرت ناک شیشے کے سِوا کچھ بھی نہیں

اے سپہرِ ناک کے ٹوٹے ستارے، السّلام
اے حریمِ کیف و مستی کے منارے، السّلام
السّلام، اے رشتۂ بشکستہ گوہر، السّلام
السّلام، اے جنّتِ بے موجِ کوثر، السّلام
السّلام، اے شیشۂ محرومِ صہبا، السّلام
السّلام، اے محملِ گم کردہ لیلےٰ، السّلام

نوجوانوں کی محبّت

نوجوانوں کی محبّت، کم سِنوں کی دوستی
صُبح کے تارے کی ضَو ہے، چَودھویں کی چاندنی
ہنستے ہیں یہ لوگ یُوں اک دوسرے کو دیکھ کر
مُنہ اندھیرے باز ہو، جس طرح بُت خانے کا دَر
وَجد کرتی ہے زمیں، اور جھومتا ہے آسماں
صُبح کو جب چھیڑتے ہیں شب روی کی داستاں
رہتے ہیں مست و غزل خواں حُسن کی تنویر میں
دِل بَندھے رہتے ہیں سب کے ایک ہی زنجیر میں

اَبر کے مانند اُٹھا کرتی ہیں اِن کی رُوح سے
نَو رَس و نَوخیز اُمنگیں، نَو شگفتہ حوصلے
بار پا سکتا نہیں اِس انجمن میں سُوءِ ظن
بے تکلف ہوتے ہیں سینے، اور ماتھے بے شکن
روز کیا کیا تازہ آب و رنگ پاتی ہیں یہاں
شب کی بزم آرائیوں سے، صبح کی سرگوشیاں
رل کے یوں چلتا ہے اِن کے ولولوں کا قافلہ
جیسے ہم آہنگ ہو لشکر کے قدموں کی صدا
رقص میں رہتے ہیں اِن کے شعلہ افشاں ولولے
مُشترک جذبات کے ابرِ خراماں کے تلے
کمسنی کے باغ کی ہلکی گھٹا کی چھاؤں میں
بھیگتی ہیں اِن کی تازہ واردانوں کی مسیں

ہمنشیں لیکن لرز جاتا ہوں مَیں یہ سوچکر
اِن محبّت کے پہاڑوں کی بنا رہے ریگ پر
کیوں نہ اِن اُونچے پہاڑوں پر ہو دانا اشکبار
کم سِنی کے زلزلوں کی ریگ کا کیا اعتبار
جب شبابِ پُختہ، اَوجِ رُوح پر پھونکیگا صُور
چَونک اُٹھے گا انفرادی کامرانی کا شعُور
دوستی سے آکے ٹکرائے گا جب ذاتی مفاد
خاک کا اِک ڈھیر بن جائے گا قصرِ اتّحاد
جب کہ رُوحِ جزو، بڑھکر رُوحِ کُل ہو جائیگی
ارتباطِ باہمی کی شمع گُل ہو جائے گی
ذہن پر چمکے گا جب خود کامیوں کا آفتاب
دِل میں کُمھلا جائے گا مہر و محبّت کا گلاب

زندگی کے تجربے گر جیں گے جب دیوانہ وار
نرم و نازک ولولوں کا ٹوٹ جائے گا ستار
بے سکت ہو جائیگی جب عقل سے دل کی ترنگ
دفعتہً اُڑ جائے گا اِن کے شبستانوں کا رنگ
یک بہ یک ہو گا تصادم باہمی اغراض میں
بے شکن جذبوں میں پڑ جائینگی لاکھوں سلوٹیں
چاک ہو جائے گا جب اخلاص کا رنگیں غلاف
بے تکلف سینوں میں پڑ جائینگے نفرت کے شگاف
الغرض یہ ابتدائے زندگی کی دوستی
بحرِ آب و گِل میں ہے جو اک ستونِ روشنی
یہ ستونِ روشنی ظلمت نشاں بن جائیگا
یہ محبت کا پہاڑ آتش فشاں بن جائے گا

رُوحِ تخریب کی آواز

(۱)

اے آدمیو، اے انسانو، اے فتنۂ و شر کے دیوتاؤ
خوب آگ ہوس کی بھڑکاؤ
ہر قلب و جگر کو برماؤ
کام آؤ تو اپنے کام آؤ
خود سے، نہ "خدا" سے شرماؤ
اے آدمیو، اے انسانو، اے فتنۂ و شر کے دیوتاؤ

(۲)

ہر ظُلم و سِتَم کے طوفاں میں
ہر عَرصۂ بُغض و بُہتاں میں
ہر جنگ و جُنوں کے مَیداں میں
جی کھول کے گھوڑے دوڑاؤ
اے آدمیو، اے انسانو، اے فتنہ و شر کے دیوتاؤ

(۳)

ہاں چوب لگا کر تاشوں پر
صد پارہ دِلوں کی قاشوں پہ
اَعدا کی ٹھنڈی لاشوں پہ
مَنڈلاؤ، بَرابَر مَنڈلاؤ
اے آدمیو، اے انسانو، اے فتنہ و شر کے دیوتاؤ

(۴)

نمرود سے بازی لے جا کر
فرعون کو دَر پر جھکوا کر
ہامان سے سجدے کروا کر
شیطان سے پانی بھروا ؤ
اے آدمیو، اے انسانو، اے فتنہ و شر کے دیوتاؤ

(۵)

طاعون ہو تُم، سرطان ہو تُم
ہاں سب سے بڑے حیوان ہو تُم
اِنسان ہو تُم، انسان ہو تُم
ہاں خون زمیں پر برساؤ
اے آدمیو، اے انسانو، اے فتنہ و شر کے دیوتاؤ

(۶)

ہر قہر وَفا ہو جائے گا
ہر دَرد دَوا ہو جائے گا
جَب حَد سے سِوا ہو جائے گا
ہاں حد سے آگے بڑھ جاؤ
اے آدمیو، اے انسانو، اے فتنہ و شر کے دیوتاؤ

(۷)

مَعلُوم ہے کیا بن جاؤ گے
صَرصَر ہو، صَبا بن جاؤ گے
بَندے ہو۔ خدا بن جاؤ گے
قُدرت کو آنکھیں دِکھلاؤ
اے آدمیو، اے انسانو، اے فتنہ و شر کے دیوتاؤ

گُزر جا

(۱)

مُسرّت کی تانیں اُڑاتا گُزر جا
طَرَب کے ترانے سُناتا گُزر جا
بشاشت کے دَریا بَہاتا گُزر جا
زمانے سے گاتا بجاتا گُزر جا
گُزر جا، زمیں کو نچاتا گُزر جا

(۲)

ہر اک دل میں طوفاں ہے خوف و خطر کا
ہر اک رُوح مسکن ہے برق و شرر کا
دُھواں ہر نفس میں ہے سوزِ جگر کا
بھیانک ہے ہر ذرّہ اس رہ گزر کا
حسینوں سے آنکھیں لڑاتا گزر جا

(۳)

مِٹا ڈال، احساسِ آزارِ غم کو
جو دانا ہے تو پھینک دے بارِ غم کو
جلا دے فرامینِ سرکارِ غم کو
جَری ہے تو ہر ایک دیوارِ غم کو
ہلاتا، ہِلاتا، گِراتا، گزر جا

(۴)

صُراحی میں بھر، بادۂ سرخوشی کو
چڑھا بے خطر، بادۂ سرخوشی کو
بنا ہم سفر، بادۂ سرخوشی کو
جدھر سے گزر، بادۂ سرخوشی کو
گِراتا، بہاتا، لنڈھاتا، گزر جا

(۵)

فراغت ہی میں نُورِ شمس و قمر ہے
خوشا وہ، فراغت سے جو بہرہ ور ہے
فراغت کا ہر لمحہ لعل و گہر ہے
فراغت کی ہر سانس، عُمرِ خضر ہے
فراغت سے پیتا، پلاتا، گزر جا

(۶)

زمان و مکاں کی سِتم رانیوں پر
مصائب کی ہنگامہ سامانیوں پر
حیاتِ دو روزہ کی نادانیوں پر
خطا اور خطا کی پشیمانیوں پر
نظر ڈالتا، مُسکراتا، گ

(۷)

دَغا کے گرَجتے ہوئے بادلوں پر
وَغا کے گرَجتے ہوئے بادلوں پر
جَفا کے گرَجتے ہوئے بادلوں پر
بَلا کے گرَجتے ہوئے بادلوں پر
مُسرّت کا پرچم اُڑاتا گ

(۸)

یہ مانا کہ یہ زِندگی، پُر اَلَم ہے
یہ مانا کہ یہ زندگی، مَوجِ سَم ہے
یہ مانا کہ یہ زندگی، اِک سِتَم ہے
یہ مانا کہ یہ زندگی، غم ہی غم ہے
سرِ غم پہ ٹھوکر لگاتا گزر جا

(۹)

مُسافِر کو کب ہے مَفر گھاٹیوں سے
جھجکتا ہے کیوں؟ آ گزر گھاٹیوں سے
نہ ڈر وادیوں سے، نہ ڈر گھاٹیوں سے
زمانے کی پُر شور و شر گھاٹیوں سے
اگر مَرد ہے گُنگناتا، گزر جا

(۱۰)

مُستَلّح نہیں گو کہیں صَحنِ ہستی
بڑھا چل، بڑھا چل، بہ ایمائے مستی
کوئی شَے نہیں، راہ کی چیرہ دستی
ہر اک گام ہے گو بلندی و پستی
مگر نشے میں لڑکھڑاتا گزر جا

(۱۱)

اگر ہر نفَس ہے، ستانے پہ مائل
اگر زندگی ہے، رُلانے پہ مائل
اگر آسماں ہے، مٹانے پہ مائل
اگر دَہر ہے رنگ اُڑانے پہ مائل
خود اِس دہر کا رنگ اُڑاتا گزر جا

(۱۲)

بڑی پُر فسوں ہے، حوادث کی دُنیا
سراسر جُنوں ہے، حوادث کی دُنیا
طلب گارِ خُوں ہے، حوادث کی دُنیا
یہ دُنیائے دُوں ہے، حوادث کی دُنیا
حوادث کو نیچا دِکھاتا گزُر جا

(۱۳)

حقائق بہت تیز و راحت شکن ہیں
حقائق بہت تند و عشرت شکن ہیں
حقائق بہت تُرش و طاقت شکن ہیں
حقائق بہت تلخ و ہمّت شکن ہیں
حقائق سے دامن بچاتا گزُر جا

(۱۴)

جہاں کی رَوِش ہے بہت ظالمانہ
رِیا، ہر فسُوں ہے۔ دَغا، ہر فسانہ
نہ کر پھر بھی یہ شکوۂ عامیانہ
کہ آنکھیں دِکھاتا ہے مجُھ کو زمانہ
زمانے کو آنکھیں دِکھاتا گزُر جا

(۱۵)

سَرِ دَیر اِک طُرفہ غوغا ہے، لیکن
حرم میں بھی اک شور برپا ہے، لیکن
کلیسا بھی خنجر دکھاتا ہے، لیکن
فریبِ مئے و نغمہ رُسوا ہے، لیکن
فریبِ مئے و نغمہ کھاتا گزُر جا

(۱۶)

چلا چپل فراغت کی تانیں اُڑاتا
گرجتا ہُوا، گُونجتا، دَندناتا
مَسرّت کی زنجیر دَرکھڑکھڑاتا
زمانے میں آیا تھا دُھومیں مچاتا
زمانے سے دُھومیں مَچاتا گُزر جا

پردیس میں دیس کی خبر

"آجکل پھر ہے وہ گُل فام یہاں جلوہ فروش"
جوشؔ، غربت میں، وطن سے یہ خبر آئی ہے
خط میں کاتب نے یہ تحریر کیا ہے کہ "یہاں
پھر صبا میں وہی اعجازِ مسیحائی ہے
پھر فضاؤں میں وہی کیف کے افسانے ہیں
پھر ہواؤں میں وہی نشّے کی انگڑائی ہے"
میرے عشرت کدۂ کُہنہ کے بام و در پر
پھر اُسی گیسوئے رنگیں کی گھٹا چھائی ہے

کل مری چشمِ تمنّا تھی جہاں محوِ جمال
پھر وہاں پرتوِ محبوب سے برنائی ہے
دِل مرا جن میں دھڑکتا تھا پھر اُن گلیوں میں
نوجوانی ہے، تبسّم ہے، دِل آرائی ہے
اَور میں دُور، بہت دُور وطن سے ہوں، جہاں
کوئی ہمدم نہ کوئی مونسِ تنہائی ہے
حَیف اُس وعدے پہ اِس طرح ہُوا ہے جو وفا
حَیف اُس عہد پہ اِس طرح جو بَرائی ہے
"اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ
میں بیاباں میں ہُوں، اور گھر میں بہار آئی ہے"

عبرتناک لاعلمی

(۱)

قلبِ جاناں ہے شاد یا مغموم؟
درد کی رَو ہے، یا نشاط کی دُھوم؟
لُطف مفقود ہے کہ غم معدُوم؟
کارفرما نسیم ہے، کہ سمُوم؟

آج کل زندگی سخی ہے کہ شُوم؟
حیف یہ بھی نہیں ہے اب معلُوم

(۲)

جس چمن پر فِدا تھا ابرِ بہار
جس چمن کی ہوائیں تھیں گُل بار
جس چمن میں حیات تھی بیدار
جس چمن میں شباب تھا سرشار

لحنِ بُلبُل ہے واں کہ نالۂ بُوم
حیف یہ بھی نہیں ہے اب معلوم

---

(۳)

ہے وُہی سادگی، وُہی باتیں؟
وُہی خلوت، وُہی مُنا جاتیں؟
یا سِکھا دی ہیں چرخ نے گھاتیں؟
عربدوں میں گُزرتی ہیں راتیں؟

حُسن ہے، یا اُسی طرح معصُوم؟
حَیف یہ بھی نہیں ہے اَب معلُوم

---

(۴۸)

وُہی اَگلی سی بے نوائی ہے؟
وُہی عُذرِ شکستہ پائی ہے؟
یا جوانی نے تیغ اٹھائی ہے؟
دِل میں اب عَزمِ خود کُشائی ہے؟

یا ابھی تک ہے قیدیِ مظلُوم؟
حیف یہ بھی نہیں ہے اب معلُوم

---

(۵)

نالۂ صُور و خوابِ نوشیں ہیں
پنجۂ دیو و دستِ سیمیں ہیں
دیدۂ کور و حُسنِ رنگیں ہیں
گُل ہیں اور بد دماغ گُل چیں ہیں

اَب بھی ہے رابطِ حاکم و محکوم؟
حیف یہ بھی نہیں ہے اَب معلوم

---

(۶)

دَورِ صحّت ہے، اَور وُہ پیکرِ ناز؟
ہنس کے بکھرا رہی ہے زُلفِ دراز؟
یا بہ ایمائے چرخِ تفرقہ باز
دُشمنوں کا مزاج ہے ناساز؟

عیش سے بہرہ ور ہے، یا محروم؟
حیف یہ بھی نہیں ہے اَب معلوم

---

(۷)

دیکھ کر آسماں پہ ابرِ بہار
سُونگھ کر تازہ پھُول گُوندھ کے ہار
سوچ کر عُمرِ رفتہ کی رفتار
پڑھ کے سوزِ فراق کے اشعار

اَب بھی ہوتی ہے وُہ کبھی مغموم؟
حَیف یہ بھی نہیں ہے اَب معلُوم

---

(۸)

اُف وہ کالی گھٹائیں، خشم آگیں
وُہ سیہ آسماں، وُہ تیرہ زمیں
وُہ سمندر، وہ پیکرِ سیمیں
کچُھ اُسے یاد بھی ہے اَب کہ نہیں؟

وُہ جنُوں کا وُفور، غم کا ہجُوم
حیف یہ بھی نہیں ہے اَب معلُوم

---

(۹)

رُوح کا آسرا تھی جو اُمّید
جوشِ ہمّت فزا تھی جو اُمّید
مُطربِ غم رُبا تھی جو اُمّید
میری مُشکل کُشا تھی جو اُمّید

اَب بھی وَیسی قوی ہے یا مَوہُوم؟
حَیف یہ بھی نہیں ہے اَب معلُوم

ہماری سوسائٹی

حوصلے سرنگوں، اُمیدیں شل
آرزو، بارِ یاس سے بوجھل
نشّہ — بجھتا ہوا سا ایک شرارہ
کیف — گرتی ہوئی سی اِک دیوار
ہر لطیفے کی تہ میں رنج و محن
ہر ظرافت میں ایک پھیکا پن
شرم سے آب، آب، جولانی
ہر ہنسی — شرمسار، کھسیانی

خال و خط پر دُھواں بناوٹ کا
کرب — بالقصد مُسکراہٹ کا
چہچہے سرد، زمزمے مجرُوح
قہقہے تک تھکے ہوئے، بے رُوح
صرف لے دے کے زرق برق لباس
وَلولے اشکبار، رُوح اُداس
زرد چہرے — نقابِ زرّیں میں
سرد لاشیں — لباسِ رنگیں میں
نہ تلاطُم، نہ تازگی، نہ ترنگ
یہ ہے اپنی سُوسائیٹی کا رنگ!

بارگاہِ قدرت میں ایک اشتراکی رِند کا مشورہ

اُٹھ، کہ اُٹھتی نہیں اب سینۂ ایّام سے آگ
دِل آفاق پہ برسا اُفقِ جام سے آگ
دامنِ تر کو بنا حائلِ برق و آتش
کہ نکلتی نہیں اَب جامۂ اَحرام سے آگ
نہ رہا کوثر و تسنیم کے چھینٹوں میں اثر
اب دِل و جاں میں لگا بادۂ گلفام سے آگ
آج اُسے کُفر کے جھونکوں سے فروزاں کر دے
کل لگائی تھی کلیجوں میں جو اسلام سے آگ

کام کے اب نہ رہے قہر و غضب کے اخگر

اب زمانے میں لگا بخشش و انعام سے آگ

اب تو گفتار میں خود آ کہ ہے بجھنے کے قریب

تو نے بھڑکائی تھی جو نامہ و پیغام سے آگ

وقت آیا ہے کہ بے پردہ ہو، اے برقِ جمال

اب دہکتی نہیں سینوں میں ترے نام سے آگ

برق رفتار جوانوں کو دکھا راہِ شرار

کہ بھڑکتی نہیں پیرانِ سبک گام سے آگ

خندۂ "خواجۂ خوش وقت" سے نکلے گا نہ کام

اب لگا اشکِ غمِ "بندۂ ناکام" سے آگ

حکم دے "شرِ" "خوش آغاز" کو ضوباری کا

کہ نکلتی نہیں اب "خیرِ" بد انجام سے آگ

"خلوتِ خاص" کے شعلے تو بہت دیکھے ہیں
آج برسا اُفقِ "جلوہ گہِ" عام سے آگ
دُور ہے، وادیٔ ایمن ہو کہ طورِ سینا
اب یہ موقع ہے کہ برسا دے ہر اک بام سے آگ
جوش کیا عیسیٰ کو ہو دیکھئے نظمِ عالم
آج روشن ہے مرے دل میں شرِ شام سے آگ

تھکی ہوئی آواز

عِرفاں کا ذوق لے لے، اے زندگی خدارا
دریائے معرفت کا مِلتا نہیں کنارا

تُجھ کو اگر خبر ہو تو اے زمیں بتا دے
کِس آسماں کا مَیں ہُوں ٹوٹا ہوُا سِتارا

اے سِرِّ آفرینش، اے رازِ زندگانی
آہو کی طرح پیہم پھرتا ہے کیوں نزارا

اب تو ہے کُچھ دِنوں سے اے ہمنشیں یہ عالم
ذرّات نے صدا دی، خورشید نے پُکارا

ہر لَے ہے آنسوؤں میں ڈُوبی ہوئی روانی
ہر شَے ہے ظلمتوں میں لپٹا ہُوا شرارا
دیوانہ وار ہر سُو مُڑ مُڑ کے دیکھتا ہُوں
واضح نہیں ابھی تک وجدان کا اشارا
چکرا کے گِر رہا ہُوں، میدانِ جستجُو میں
اے فکر! دستگیری!! اے شاعری! سہارا!!!
کشتی شکستگانیم، اے بادِ شُرطہ، برخیز
باشد کہ باز بینیم آں یارِ آشنارا!!

(حافظ)

شہیدِ لطافت

(۱)

غَلَط ہے کہ کُلفت کا مارا ہُوا ہُوں
نہ کُلفت، نہ عُسرت کا مارا ہُوا ہُوں
نہ عِفرِیتِ قُوّت کا مارا ہُوا ہُوں
نہ دیوِ سیاست کا مارا ہُوا ہُوں
خود اپنی ہی فطرت کا مارا ہُوا ہُوں

(۲)

کلاموں کے ابہام، مُجھ سے نہ پُوچھو
رقیبانہ پیغام، مُجھ سے نہ پُوچھو
غمِ حرفِ الزام، مُجھ سے نہ پُوچھو
خمِ تیغِ دُشنام، مُجھ سے نہ پُوچھو
کہ حرف و حکایت کا مارا ہُوا ہُوں

(۳)

کِسی کی رکاکت سے مُضطر نہیں ہُوں
کِسی کی سفاہت سے مُضطر نہیں ہُوں
کِسی کی دناءت سے مُضطر نہیں ہُوں
کِسی کی رذالت سے مُضطر نہیں ہُوں
خود اپنی شرافت کا مارا ہُوا ہُوں

(۴)

چلا ہے کبھی مجھ پہ بھی غم کا جادو؟
ہُوا ہُوں کسی ایک دن سر بہ زانو؟
کبھی فرشِ ماتم پہ بدلے ہیں پہلو؟
بہاؤں تو کیوں شامِ حرماں پر آنسو؟
کہ صبحِ مسرّت کا مارا ہُوا ہُوں

(۵)

کسی دِن بھی نِکلا نہیں گلِستاں سے
سدا دوستی ہی رہی باغباں سے
عقیدت رہی برق کو آشیاں سے
شکایت کو الفاظ لاؤں کہاں سے
کہ لطف و عنایت کا مارا ہُوا ہُوں

(۶)

کسی کی کدورت سے واقف نہیں ہوں
کسی کی شرارت سے واقف نہیں ہوں
کسی کی شقاوت سے واقف نہیں ہوں
کسی کی عداوت سے واقف نہیں ہوں
کسی کی محبّت کا مارا ہوا ہوں

(۷)

زمانے کی شدّت سے کیا کام مجھ کو
شکایاتِ قسمت سے کیا کام مجھ کو
حوادث کی لعنت سے کیا کام مجھ کو
ہوائے نحوست سے کیا کام مجھ کو
نسیمِ سعادت کا مارا ہوا ہوں

(۸)

نہ مَیں زحمتِ سخت کوشی سے نالاں
نہ فقدانِ صد گرمجوشی سے نالاں
نہ قسمت کی ارزاں فروشی سے نالاں
نہ گمنامیوں کی خموشی سے نالاں
کہ گلبانگِ شہرت کا مارا ہُوا ہُوں

(۹)

مجھے دشتِ غربت نے چھیڑا نہیں ہے
سفر کی صعوبت نے چھیڑا نہیں ہے
بگولوں کی آفت نے چھیڑا نہیں ہے
بیاباں کی وحشت نے چھیڑا نہیں ہے
گلستاں کی نکہت کا مارا ہُوا ہُوں

(۱۰)

نہیں، میں نہیں چرخِ گرداں کا شاکی
نہ خنجر، نہ شمشیرِ بُرّاں کا شاکی
نہ سیلاب و صرصرِ نہ طوفاں کا شاکی
نہ خس کا نہ خارِ مُغیلاں کا شاکی
گلوں کی نزاکت کا مارا ہؤا ہُوں

(۱۱)

نہ گردُوں ہؤا موجبِ سرگرانی
نہ گیتی بنی باعثِ نوحہ خوانی
یہ زیبا نہیں مُجھ کو اے یارِ جانی
کروں شکوۂ خسروِ قہرمانی
کہ سرکارِ رحمت کا مارا ہؤا ہُوں

(۱۲)

سَتایا نہیں خوئے نفرت نے اَب تک
لُبھایا نہیں ذَوقِ عزّت نے اَب تک
پُکارا نہیں حُبّ دَولت نے اَب تک
چھُوا تک نہیں ہے کثافت نے اَب تک

سَراسَر لطافت کا مارا ہُوا ہُوں

اے شیخِ شہر!

اے شیخِ شہر خرقۂ سالوس اُتار دے
دِل کو بھی مثلِ کاکلِ شب گوں سنوار دے

رہتا ہے اوجِ نُطق پہ جس ماہ وش کا نام
اُس ماہ وش کو خلوتِ دِل میں بھی بار دے

ہر دِل پہ کندہ کرتا ہے جو نقشِ دِل نشیں
خود اپنی لوحِ جاں پہ بھی وہ نقش اُبھار دے

جس درسِ خاص کی ہیں مُریدوں پہ بارشیں
اپنے کو بھی وہ درسِ ملائک شکار دے

تا چند دُوسروں کے نکھارا کریگا رنگ؟
اپنا بھی رنگ، بہرِ خدا، اب نکھار دے

اِس طُرّۂ کُلاہ کی تزئین تا کُجا؟
باطن کے تاج کو بھی دُرِ شاہوار دے

جس کو لُٹا رہا ہے زمانے پہ بے دریغ
اپنے کو بھی وہ دَولتِ عرفانِ یار دے

برسیں گے پھُول جنّتِ سُلطاں پہ تا بہ کَے؟
دِشتِ گدائے راہ کو بھی برگ و بار دے

تا چند منعموں کے لئے مُژدۂ چمن؟
بے زَر کو بھی پیامِ نسیمِ بہار دے

کیوں جوشؔ اُلجھ رہا ہے عبث شیخِ شہر سے
یہ نشّہ وُہ نہیں جسے تُرشی اُتار دے

سلام

محراب کی ہوس ہے نہ منبر کی آرزو
ہم کو ہے طبل و پرچم و لشکر کی آرزو

بامِ جدال و گردِ رہِ عزم کا ہے شوق
اورنگ کی ہوس ہے، نہ افسر کی آرزو

کانٹوں پہ حق پرست بدلتے ہیں کروٹیں
بالش کا اشتیاق، نہ بستر کی آرزو

تعویذ کیا کروں گا کہ اِن بازوؤں کو ہے
اژدر شکارِ قوتِ حیدر کی آرزو

کرنا ہے اپنے خون میں ہم کو شناوری
تسنیم کی تڑپ ہے، نہ کوثر کی آرزو

اُس آرزو سے میرے لہُو میں ہے جزر و مد
دشتِ بلا میں تھی جو بہتّر[۲۷] کی آرزو

رنگیں مزاجیوں کا نہیں ہے محل ہنوز
دِل کو ہے خُونِ مَرحب و عَنتَر کی آرزو

بادِ مُراد و آبِ طَرَب کا نہیں ہے وقت
طوفاں کا اشتیاق ہے، صَرصَر کی آرزو

رقصِ پَری وشان و خرامِ صَبا، حَرام
دِل کو ہے ضربِ فاتحِ خیبر کی آرزو

ہاں عمرِ جاوداں کی ہمیں بھی نوید دے
اے موت، اے جوانیِ اکبر کی آرزو

جوش اُس سبوئے قلب پہ کون و مکاں نثار
غلطاں ہو جس میں ساقیٔ کوثر کی آرزو

سلام

کیا نمازِ شاہ تھی، ارکانِ ایمانی کے ساتھ
دِل بھی جُھک جاتا تھا ہر سجدے میں پیشانی کے ساتھ

حشر تک زندہ ہے نیرِ انام اے ابنِ رسُول!
کر چکا ہے تو وہ احساں، نوعِ انسانی کے ساتھ

اُن کے آگے صولتِ دُنیا کا ذکر، او ابنِ سعد
کھیلتی ہے جن کی ٹھوکر تاجِ سلطانی کے ساتھ

غیرتِ حق کو کہیں دیکھو نہ آجائے جلال
ظالمو! ہولی نہ کھیلو خونِ انسانی کے ساتھ

باندھتی ہو کیا ہوا، اے اہرمن کی آندھیو!
کھیلنا آساں نہیں ہے شمعِ یزدانی کے ساتھ

ہمّتِ معصوم کو فاسق سے کیا خوف و خطر
یہ سفینہ مضحکہ کرتا ہے طغیانی کے ساتھ

صرف رو لینے سے قوموں کے نہیں پھرتے ہیں دن
خوں فشانی بھی ہے لازم اشک افشانی کے ساتھ

آنکھ میں آنسو ہوں سینوں میں شرارِ زندگی
موجۂ آتش بھی ہو، بہتے ہوئے پانی کے ساتھ

اہلِ بیتِ پاک کی ہر سانس کو اے مدّعی!
ہاں ملا کر دیکھ لے آیاتِ قرآنی کے ساتھ

جوش ہم ادنیٰ غلامانِ علیِ مرتضےٰ
تمکنت سے پیش آتے ہیں جہانبانی کے ساتھ

حسینؑ اور انقلاب

(۱)

ہمراز، یہ فسانۂ آہ و فغاں، نہ پُوچھ
دو دِن کی زندگی کا غمِ این و آں، نہ پُوچھ
کیا کیا حیاتِ ارض کی ہیں تلخیاں، نہ پُوچھ
کس درجہ ہولناک ہے یہ داستاں، نہ پُوچھ

تفصیل سے کہوں، تو فلک کانپنے لگے
دوزخ بھی فرطِ شرم سے منہ ڈھانپنے لگے

(۲)

دُنیا کی ہر خوشی ہے غم و دَرد سے دوچار
ہر قہقہے کی گُونج میں ہے چشمِ اشکبار
کیا خار و خَس کہ وہ تو ہیں معتوبِ روزگار
نسرین و نسترن میں بھی پنہاں ہے نوکِ خار

نغمے ہیں جُنبشِ دلِ مُضطر لئے ہُوئے
گُل برگ تک ہے تُرّشِ خنجر لئے ہُوئے

(۳)

یارانِ خوش وضع و نگارانِ مہ جبیں
آبِ نشاط و لعلِ لب و زلفِ عنبریں
کُوئے مغان و بُوئے گُل و رُوئے دِلنشیں
زور و زن و ذکاوت و ذہن و زر و زمیں

جو شَے بھی ہے وہ دَرد کا پہلُو لئے ہُوئے
ہر گوشۂ نشاط ہے آنسو لئے ہُوئے

---

(۴۱)

بیگانۂ حدود ہے انساں کی آرزو
پیچیدہ ہر نظر میں ہے اِک تازہ جستجو
تھمتی نہیں کہیں بھی تمنّائے برق خو
ساقی کا وہ کرم ہے کہ بھرتا نہیں سبو

ارماں کی شاہراہ میں منزل نہیں کوئی
اِس بحرِ بے کنار کا ساحل نہیں کوئی

---

(۵)

اِس لیلیٔ حیات کی اللہ ری دار و گیر
ہر لوچ، اِک کمان ہے، ہر ناز، ایک تیر
اِس کے کرم میں بھی وُہ حرارت ہے ہم صفیر
جس کے مقابلے میں جہنّم ہے، زمہریر

اُلجھے جو اس کے گیسوئے پیچاں کے جال میں
لگ جائے آگ، دامنِ قطبِ شمال میں

---

(۶)

اَمراض سے کسی کا بڑھاپا ہے اِک وَبال
آلام سے کسی کی جوانی ہے پائمال
اِس کو ہے خوفِ ننگ، اُسے نام کا خیال
روزی سے کوئی تنگ، کوئی عِشق سے نڈھال

ہر سَانس ہے نوید، عذابِ عظیم کی
گھبرا کے دو دُہائی "خُدائے رحیم" کی

---

(۲)

اِس خُوں چکاں حیات کے آلام کیا کہوں
قُدرت نہیں فسانۂ ایّام کیا کہوں
دارائے کائنات کے اِنعام، کیا کہوں
یہ داستانِ مرحمتِ عام، کیا کہوں

کہہ دوں، تو دِل سے خون کا چشمہ اُبل پڑے
اَور چُپ رہوں، تو مُنہ سے کلیجہ نکل پڑے

---

(۸)

نوعِ بشر پہ ہے جو عقوبت، نہ پُوچھیے
سفّاک زندگی کی شقاوت، نہ پُوچھیے
جورِ حیات و جبرِ مشیّت، نہ پُوچھیے
کتنا رقیق ہے دلِ قُدرت، نہ پُوچھیے

سَو سال اگر خزاں کے، تو دو دن بہار کے
قرباں ہجُومِ رحمتِ پروردگار کے!!

---

(۹)

یُوں تو غمِ معاش کا سوزِ نہاں ہے اَور
تکلیفِ جاں گُدازیٔ عشقِ بتاں ہے اَور
لب تشنگیٔ شیبؒ عذابِ خزاں ہے اَور
اعلانِ اَمرِ حق کی مگر داستاں ہے اَور

"گفتارِ صدق، مایۂ آزار می شوَد
چُوں حرفِ حق بلند شوَد، دار می شوَد"

(صائب)

---

(۱۰)

ہاں، اِس بَلا سے کوئی بَلا بھی بڑی نہیں،
کیا اُس کو علم، جس پہ یہ بپتا پڑی نہیں
کُشتوں کی اِسکے، لاش بھی اکثر گڑی نہیں
اعلانِ امرِ حق سے کوئی شَے کڑی نہیں

بے جُرم، خود کو جُرم میں جو رانڈھ لے، وُہ آئے
اِس راہ میں، جو سر سے کفن باندھ لے، وُہ آئے

---

(۱۱)

تکلیفِ رُشد و کاہشِ تبلیغ، الاماں
یہ دائرہ ہے، دائرۂ مرگِ ناگہاں
پیہم یہاں سروں پہ کڑکتی ہیں بجلیاں
بارِ اَلم سے بولنے لگتے ہیں اُستخواں

ہر گام پر، حیات کے چھپّے کو فق کرے
مَرنا جو چاہتا ہو، وہ اعلانِ حق کرے

---

(۱۲)

کیسے کوئی عزیز، روایات چھوڑ دے
کچھ کھیل ہے کہ کہنہ حکایات چھوڑ دے
گُھٹّی میں تھے جو حل، وہ خیالات چھوڑ دے
ماں کا مزاج، باپ کے عادات چھوڑ دے

کس جی سے کوئی رشتۂ اوہام توڑ دے
ورثے میں جو ملے ہیں وہ اصنام توڑ دے

---

(۱۳۳)

اَوہام کا رباب ، قدامت کا ارغنُوں
فرسُودگی کا سحر ، رَوایات کا فسُوں
اقوال کا مِراق ، حِکایات کا جنُوں
رسم و رَواج و صُحبت و میراث و نسل و خُوں

افسوس یہ وہ حلقۂ دامِ خیال ہے
جس سے بڑے بڑوں کا نکلنا مُحال ہے

---

(۱۴۰)

اِس بزمِ ساحری میں، جہالت کا ذِکر کیا
خود علم کے حواس بھی رہتے نہیں بجا
اَوہام، جب دِلوں میں بجاتے ہیں دائرا
عقلوں کو سُوجھتا ہی نہیں رقص کے سوا

تاریخ جُھومتی ہے فسانوں کے غول میں
بُوڑھے بھی ناچتے ہیں جوانوں کے غول میں

---

(۱۵)

جس دائرے میں قصرِ قدامت کا ہو طواف
جدّت کے "جرم" کو کوئی کرتا نہ ہو معاف
بگڑے ہوئے رسوم کا ذہنوں پہ ہو غلاف
آواز کون اٹھائے وہاں جہل کے خلاف

آواز اُٹھائے موت کی جو آرزو کرے
ورنہ مجال ہے کہ یہاں گفتگو کرے

---

(۱۶)

ہونا ہے جو سماج میں جُویائے انقلاب
ملتا ہے اُس کو مُرتد و زندیق کا خطاب
پہلے تو اُس کو آنکھ دکھاتے ہیں شیخ و شاب
اُس پر بھی وہ نہ چُپ ہو تو پھر قوم کا عتاب

بڑھتا ہے ظلم و جَور کے تیور لئے ہُوئے
تشنیع و طعن و دشنہ و خنجر لئے ہُوئے

---

(۱۷)

اُٹھتا ہے غُلغلہ کہ یہ زندیقِ نامُراد
کج فکر و کج نگاہ و کج اخلاق و کج نہاد
پھیلا رہا ہے عالمِ اخلاق میں فساد
اے صاحبانِ جذبۂ دیرینۂ جہاد

ہاں جلد اُٹھو، تباہیِ باطل کے واسطے
جنّت ہے ایسے شخص کے قاتل کے واسطے

---

(۱۸)

اور بالخصوص جب ہو حکومت کا سامنا
رُعب و شِکوہ و جاہ و جلالت کا سامنا
شاہانِ کج کُلاہ کی ہیبت کا سامنا
قرنا و طبل و ناوک و رایت کا سامنا

لاکھوں میں ہے وہ ایک کروڑوں میں فرد ہے
اُس وقت جو ثبات دِکھائے وُہ مرد ہے

---

(۱۹)

اَور بالخصوص بند ہو جب ہر درِ نجات
حق تشنہ لب ہو دشت میں، باطل لبِ فُرات
دستِ اَجل میں ہو زن و فرزند تک کی ذات
حائل ہو مرگ و زیست میں، لے دے کے ایک رات

یہ وہ گھڑی ہے کانپ اُٹھے شیرِ نر کا دِل
اِس تہلکے کو چاہئے فَوق البشر کا دِل

---

(۲۰)

وُہ کربلا کی رات، وُہ ظلمت ڈراونی
وُہ مرگِ بے پناہ کے سائے میں زندگی
خیموں کے گردِ وپیش وُہ پُر ہول خامُشی
خاموشیوں میں دُور سے وُہ چاپ موت کی

تھی پُشتِ وقت، بارِ الم سے جھُکی ہُوئی
ارض و سما کی سانس تھی گویا رُکی ہُوئی

---

(۲۱)

وہ اہلِ حق کی تشنہ دہاں، مختصر سپاہ
باطِل کا وُہ ہجوم کہ اللہ کی پناہ
وہ ظُلمتوں کے دام میں زہرا کے مہر و ماہ
تارے وُہ فرطِ غم سے جُھکائے ہُوئے نگاہ

وُہ دِل بُجھے ہُوئے وُہ ہوائیں تھمی ہُوئی
وُہ اِک بہن کی، بھائی پہ نظریں جمی ہُوئی

---

(۲۲)

لبریزِ زہرِ جور سے وہ وحشت کا ایاغ
دُکھتے ہُوئے وُہ دِل، وُہ ٹپکتے ہوئے دماغ
آنکھوں کی تیلیوں سے عیاں وُہ دِلوں کے داغ
پُرہول ظُلمتوں میں وُہ سہمے ہُوئے چراغ

بکھرے ہُوئے ہوا میں وُہ گیسو رسُولؐ کے
تاروں کی روشنی میں وہ آنسو بتُولؑ کے

---

(۲۳)

وہ رات، وہ فرات، وہ موجوں کا خلفشار
عابد کی کروٹوں پہ وہ بیچارگی کا بار
وہ زلزلوں کی زد پہ خواتین کا وقار
اصغر کا پیچ و تاب وہ جھولے میں بار بار

اصغر میں پیچ و تاب نہ تھا اضطراب کا
وہ دِل دھڑک رہا تھا رسالت مآب کا

---

(۲۴)

وہ رات، جب امام کی گونجی تھی یہ صدا
اے دوستانِ صادق و یارانِ باصفا
باقی نہیں رہا ہے کوئی اَور مرحلا
اب سامنا ہے موت کا، اور صرف موت کا

آنے ہی پر بلائیں ہیں اَب تحت و فوق سے
جانا جو چاہتا ہے، چلا جائے شوق سے

---

(۲۵)

اَور سُنتے ہی یہ بات، بصد کرب و اضطراب
شبّیرؑ کو دیا تھا یہ انصار نے جواب
"دیکھیں جو ہم یہ خواب بھی، اے ابنِ بُوتراب!
واللہ فرطِ شرم سے ہو جائیں آب آب

قرباں نہ ہو جو آپ سے والا صفات پر
لعنت اُس امن و عیش پہ، تُف اُس حیات پر"

(۲۶)

"کیا آپ کا خیال ہے یہ شاہ ذی حَشَم!
ہم ہیں اسیرِ سُود و زیاں، صیدِ کیف و کَمَ
خود دیکھ لیجئے گا کہ گاڑیں کے جب قدَم
ہٹنا تو کیا، ہلیں گے نہ دشت و غا سے ہم

پُتلے ہیں ہم حسد بلے کے، پیکر ہیں سنگ کے
انساں نہیں، پہاڑ ہیں میدانِ جنگ کے

---

(۲۷)

ہاں ہاں وہ رات، دہشت و بیم و رجا کی رات
افسونِ جاں کنی و طلسمِ قضا کی رات
لب تشنگانِ ذرّیتِ مصطفا کی رات
جو حشر سے عظیم تھی وُہ کربلا کی رات

شبّیرؑ نے حیات کا عنواں بنا دیا
اُس رات کو بھی مہرِ درخشاں بنا دیا

---

(۲۸)

تاریخ دے رہی ہے یہ آوازِ دمبدم
دشتِ ثبات و عزم ہے، دشتِ بلا و غم
صبرِ مسیح و جرأتِ سقراط کی قسم
اِس راہ میں ہے صرف اِک انسان کا قدم

جس کی رگوں میں آتشِ بدر و حُنین ہے
جس سُورما کا اسمِ گرامی حُسینؑ ہے

---

(۲۹)

جو صاحبِ مزاجِ نبوّت تھا، وہ حسینؑ
جو وارثِ ضمیرِ رسالت تھا، وہ حسینؑ
جو خلوتیٔ شاہدِ قدرت تھا، وہ حسینؑ
جس کا وجود، فخرِ مشیّت تھا، وہ حسین

سانچے میں ڈھالنے کے لئے کائنات کو
جو تولتا تھا نوکِ مژہ پر حیات کو

---

(۳۰)

جو اک نشانِ تشنہ دہانی تھا، وہ حسینؑ
گیتی پہ عرش کی جو نشانی تھا، وہ حسینؑ
جو خُلد کا امیرِ جوانی تھا، وہ حسینؑ
جو اک سنِ جدید کا بانی تھا، وہ حسینؑ

جس کا لہو تلاطمِ پنہاں لیے ہوئے
ہر بوند میں تھا نوح کا طوفاں لیے ہوئے

---

(۱۳۱)

جو کاروانِ عزم کا رہبر تھا، وہ حسینؑ
خود اپنے خوں کا جو شناور تھا، وہ حسینؑ
اِک دینِ تازہ کا جو پیمبر تھا، وہ حسینؑ
جو کربلا کا داورِ محشر تھا، وہ حسینؑ

جس کی نظر پہ شیوۂ حق کا مدار تھا
جو رُوحِ انقلاب کا پروردگار تھا

---

(۳۲)

ہاں، اَب بھی جو منارۂ عظمت ہے، وہ حُسَین
جس کی نگاہ، مَرگِ حکُومت ہے، وہ حُسَینؑ
اب بھی جو محوِ درسِ بغاوت ہے، وہ حُسَینؑ
آدم کی جو دلیلِ شرافت ہے، وہ حُسَینؑ

واحِد جو اِک نمُونہ ہے ذِبحِ عظیم کا
شاہد ہے جو "خُدا" کے مذاقِ سلیم کا

---

(۳۳)

ہاں وہ حسینؑ جس کا ابد آشنا ثبات
کہتا ہے گاہ گاہ حکیموں سے بھی یہ بات
یعنی درونِ پردۂ صد رنگِ کائنات
اِک کارساز "ذہن" ہے، اک "ذی شعور ذات"

سجدوں سے کھینچتا ہے جو "مسجود" کی طرف
تنہا جو اِک اشارہ ہے "معبود" کی طرف

---

(۳۴)

جس کا وجود، عدل و مساوات کی مُراد
جو کردگارِ امن تھا، پیغمبرِ جہاد
تحویلِ زندگی میں پئے رفعِ ہر فساد
قُدرت کی اِک امانتِ زرّیں ہے جسکی یاد

سوزاں ہے قلبِ خاک، جو خونِ مُبین سے
اِک لَو نکل رہی ہے ابھی تک زمین سے

---

(۳۵)

عزّت پہ جس نے سر کو فدا کر کے دَم لیا
صدق و منافقت کو، جُدا کر کے دَم لیا
حق کو ابد کا تاج عطا کر کے دَم لیا
جس نے یزیدیت کو فنا کر کے دَم لیا

فتنوں کو جس پہ ناز تھا وہ دِل بُجھا دیا
جس نے چراغِ دولتِ باطِل بُجھا دیا

---

(۳۶)

عالَم میں ہو چکا ہے مُسلسل یہ تجربا
قوّت ہی زندگی کی رہی ہے گرہ کُشا
سَر ضُعف کا ہمیشہ رہا ہے جُھکا ہوا
ناطاقتی کی موت ہے، طاقت کا سامنا

طاقت سی شَے مگر خجل و بدنصیب تھی
ناطاقتیِ حُسینؑ کی کتنی عجیب تھی!!

---

(۳۷)

طاقت سی شَے کو خاک میں جس نے مِلا دیا
تختہ اُلٹ کے، قصرِ حکومت کو ڈھا دیا
جس نے ہوَا پہ، رُعبِ اَمارت اُڑا دیا
ٹھوکر سے جس نے افسرِ شاہی گرا دیا

اِس طرح جس سے ظُلم، سیہ فام ہوگیا
لفظِ یزید، داخلِ دُشنام ہوگیا

---

(۳۸)

پانی سے تین روز ہوئے جس کے لب نہ تر
تیغ و تبر کو سونپ دیا جس نے گھر کا گھر
جو مر گیا ضمیر کی عزت کے نام پر
ذلت کے آستاں پہ جھکایا مگر نہ سر

لی جس نے سانس، رشتہ شاہی کو توڑ کر
جس نے کلائی موت کی رکھ دی مروڑ کر

---

(۳۹)

جس کی جبیں پہ کج ہے خود اپنے لہُو کا تاج
جو مرگ و زندگی کا ہے اِک طُرفہ امتزاج
سر دے دیا مگر نہ دِیا ظُلم کو خراج
جس کے لہو نے رکھ لی تمام انبیاء کی لاج

سُنتا نہ کوئی دہر میں صدق و صفا کی بات
جس مردِ سر فروش نے رکھ لی "خُدا" کی بات

---

(۴۰)

ہر چند اہلِ جَور نے چاہا یہ بارہا
ہو جائے محو، یادِ شہیدانِ کربلا
باقی رہے نہ نام زمیں پر حُسینؑ کا
لیکن کسی کا زورِ عزم و نہ چل سکا

عباسِ نامور کے لہُو سے دُھلا ہُوا
اَب بھی حُسینیت کا عَلَم ہے کھُلا ہُوا

---

(۱۴۱)

یہ صبحِ انقلاب کی جو آج کل ہے ضَو
یہ جو مچل رہی ہے صَبا، پھَٹ رہی ہے پَو
یہ جو چراغِ ظلم کی تھرّا رہی ہے لَو
در پردہ یہ حُسینؑ کے انفاس کی ہے رَو

حق کے چھِڑے ہوئے ہیں جو یہ ساز، دوستو
یہ بھی اُسی جَری کی ہے آواز، دوستو

---

(۴۲)

جس کا ہجومِ درد و اَلم سے یہ حال تھا
سِینہ تھا پاش پاش جگر پائمال تھا
رُخ پر تھا تشنگی کا دُھواں دِل نڈھال تھا
اِس کرب میں بھی جس کو فقط یہ خیال تھا

آتش برس رہی ہے تو برسے خیام پر
آنے نہ پائے آنچ مگر حق کے نام پر

---

(۴۳)

ہر چند ایک شاخ، چمن میں ہری نہ تھی
ماتھا عرق عرق تھا، لبوں پر تری نہ تھی
باطل کی ان بلاؤں پہ بھی چاکری نہ تھی
یہ داوری تھی اصل میں پیغمبری نہ تھی

رنگ اُڑ گیا حکومتِ بدعت شعار کا
عزمِ حسینؑ، عزم تھا پروردگار کا

---

(۴۴)

تھی جس کے دوشِ پاک پہ اہلِ وِلا کی لاش
انصارِ سر فروش کی لاش، اقربا کی لاش
عبّاس سے مجاہدِ تیغ آزما کی لاش
قاسم سے شاہزادۂ گلگوں قبا کی لاش

پھر بھی یہ دُھن تھی صبر کی زُلفوں سی بَل نہ جائے
اِس خوف سے کہ حق کا جنازہ نکل نہ جائے

---

(۴۵)

زار و نزار و تشنہ و مجروح و ناتواں
تنہا کھڑا ہوا تھا جو لاکھوں کے درمیاں
گھیرے تھے جس کو تیر و تبر، ناوک و سناں
اور سو رہا تھا موت کے بستر پہ کارواں

اتنا نہ تھا کہ حقِ رفاقت سے کام لے
گرنے لگیں اگر تو کوئی بڑھ کے تھام لے

---

(۴۶)

ہاں وہ حسینؑ خستہ و مجروح و ناتواں
ساکت کھڑا ہوا تھا جو لاشوں کے درمیاں
سنتا رہا سکون سے جو پیرِ نیم جاں
اکبرؑ سے ماہ رُو کی جوانی کی ہچکیاں

ہے ہے کی آ رہی تھی صدا کائنات سے
پھر بھی قدم ہٹائے نہ راہِ ثبات سے

---

(۴۷)

ہاں اے حسینِ تشنہ و رنجور، السّلام
اے میہمانِ عرصۂ بے نور، السّلام
اے شمعِ حلقۂ شبِ عاشور، السّلام
اے سینۂ حیات کے ناسور، السّلام

اے ساحلِ فرات کے پیاسے ترے نثار
اے "آخری نبیؐ" کے نواسے ترے نثار

---

(۴۸)

ہاں اے حسینؑ بیکس و ناچار، السّلام
اے کُشتگانِ عشق کے سردار، السّلام
اے سوگوارِ یاور و انصار، السّلام
اے کاروانِ مُردہ کے سالار، السّلام

افسوس اے وطن سے نکالے ہوئے حسینؑ
اے فاطمہؑ کی گود کے پالے ہوئے حسینؑ

---

(۴۹)

تُو، اَور تیرے حَلق پر تلوار، ہائے ہائے
زنجیر اَور عابدِ بیمار، ہائے ہائے
زینب کا سَر کُھلے سرِ بازار، ہائے ہائے
سَر تیرا، اور یزید کا دربار، ہائے ہائے

اِنسان، اِس طرح اُتر آئے عِناد پر
لعنت خُدا کی حشر تک ابنِ زیاد پر

---

(۵۰)

تجھ سا شہید کون ہے عالم میں اے حسینؑ
تو ہے ہر ایک دیدۂ پُرنم میں اے حسینؑ
زہّاد ہی نہیں ہیں ترے غم میں اے حسینؑ
ہم رند بھی ہیں حلقۂ ماتم میں اے حسینؑ

آزاد جو خیال میں ہیں، اور کلام میں
وہ بھی اسیر ہیں تری زلفوں کے دام میں

---

(۵۱)

یُوں تو دُرونِ سینۂ تاریخ روزگار
دَولت ہے بے حساب، جواہر ہیں بے شُمار
لیکن ترا وجُود ہے اے مردِ حق شعار
عزمِ بشر کی واحد و بے مثل یادگار

تکتا ہے تجھ کو وقتِ جہاں سوز دُور سے
تُو ہے بلند، ضربِ سنین و شہُور سے

---

(۵۲)

اِس باغِ دہر میں پئے تفسیرِ رنگ و بُو
یُوں تو ہے ہر رَوِش پہ اک انبارِ گفتگو
لیکن برائے گوشِ حکیمانِ راز جُو
عالم میں صرف اِک سُخنِ گفتنی ہے تُو

مَردانگی کے طُور کا تنہا کلیم ہے
تُو سینۂ حیات کا قلبِ سلیم ہے

---

(۵۳)

اے رہبرِ خجستہ وُ اے ہادیٔ غیوُر
تُو حافظے کا ناز ہے، تاریخ کا غرُور
اب بھی ترے نشانِ قدم سے ہے وہ سُرُور
لَوحِ جبینِ وقت پہ غلطاں ہے مَوجِ نوُر

تُو ہے وُہ مہر، دفترِ عزم و ثبات پر
اَبتک دَمک رہی ہے جو پُشتِ حیات پر

---

(۵۴)

ہاں اے حُسینؑ، ابنِ علیؑ ہر بسرِ انام
اے منبرِ خودی کے حیات آفریں پیام
اے نُطقِ زندگی کے مُقدّس ترین نام
اے چرخِ انقلاب کے ابرِ جواں خرام

غازہ ہے تیرا خُون، رُخِ کائنات کا
ہر قطرہ "کوہِ نُور" ہے تاجِ حیات کا

---

(۵۵)

جس بحرِ ظلم و جور کے گرداب میں تھا تو
نازل پہاڑ پر ہو تو بن جائے آبِ جو
سینے میں ابر کے نہ رہے روحِ رنگ و بو
آہن کے جوہروں سے ٹپکنے لگے لہو

یخ تک برنگِ آتشِ دوزخ دہک پڑے
ماتھے سے آگ کے بھی پسینہ ٹپک پڑے

---

(۵۶)

اے خنجرِ برہنہ و اے تیغِ بے نیام
اے حق نواز، امیرِ نبوّت بدوش امام
اے تیرگی کی بزم میں خورشید کے پیام
اے آسمانِ درسِ عمل کے مہِ تمام

رہتی ردائے شام کی ظلمت ہی دین پر
ہوتا نہ تُو، تو صُبح نہ ہوتی زمین پر

---

(۵۷)

پھر حق ہے آفتاب لبِ بام اے حسینؑ
پھر بزمِ آب و گِل میں ہے کہرام اے حسینؑ
پھر زندگی ہے سُست و سُبک گام اے حسینؑ
پھر حُریت ہے موردِ الزام اے حسینؑ

ذوقِ فساد و ولولۂ شر لئے ہوئے
پھر عصرِ نَو کے شمر ہیں خنجر لئے ہوئے

---

(۵۸)

ہاں خاتمِ حیاتِ اَبد کا نگیں ہے تُو
گردُونِ گیر و دار کا مہرِ مُبیں ہے تُو
اِک زندہ حدِّ فاصلِ دُنیا و دیں ہے تُو
کونین کا تخیّلِ عہد آفریں ہے تُو

پھر دشتِ جنگ کو ہے ترا انتظار، اُٹھ
اُٹھ، روزگارِ تازہ کے پروردگار، اُٹھ

---

(۵۹)

مجروح پھر ہے عدل و مساوات کا شعار
اس بیسویں صدی میں ہے پھر طرفہ انتشار
پھر نائبِ یزید ہیں دُنیا کے شہریار
پھر کربلائے نَو سے ہے نوعِ بشر دوچار

اے زندگی! جلالِ شہِ مشرقین دے
اس تازہ کربلا کو بھی عزمِ حسینؑ دے

---

(۶۰)

پھر گرم ہے فساد کا بازار، دوستو
سر ہا یہ پھر ہے بر سرِ آزار، دوستو
تا کَے یہ خوفِ اندک و بسیار، دوستو
تلوار، ہاں اُٹھی ہوئی تلوار، دوستو

جو نیشِ تیز ہو خرِ امارت کو چاٹ کر
رکھ دے جو سیم و زر کے پہاڑوں کو کاٹ کر

---

(۶۱)

بل کھا رہے ہیں دہر میں پھر سیم و زر کے ناگ
گونجے ہوئے ہیں گنبدِ گرداں میں غم کے راگ
پھر موت رخشِ زیست کی تھامے ہوئے ہے باگ
تا آسماں بلند ہوا ہے زندگی کی آگ

فتنے کو اپنی آنچ کے جھولے میں جھونک دے
ہاں پھونک دے قبائے امارت کو پھونک دے

---

(۶۲)

اے دوستو! فرات کے پانی کا واسطہ
آلِ نبیؐ کی تشنہ دہانی کا واسطہ
شبّیرؑ کے لہو کی روانی کا واسطہ
اکبرؑ کی ناتمام جوانی کا واسطہ

بڑھتی ہوئی جوان اُمنگوں سے کام لو
ہاں تھام لو، حُسینؑ کے دامن کو تھام لو

---

(۶۳)

آئینِ کشمکش سے ہے دُنیا کی زیب و زین
ہر گام ایک "بدر" ہو، ہر سانس اک "حُنین"
بڑھتے رہو یُونہیں پئے تسخیرِ مشرقین
سینوں میں بجلیاں ہوں، زبانوں پہ "یا حُسین"!

تُم حیدری ہو، سینۂ اژدر کو پھاڑ دو
اِس خیبرِ جدید کا دَر بھی اُکھاڑ دو

---

(۶۴)

جاری رہے کچھ اور یونہیں کاوشِ ستنیز
ہر وار، بے پناہ ہو۔ ہر ضرب، لرزہ خیز
وہ فوجِ ظلم و جور ہوئی مائلِ گریز
اے خون، اور گرم ہو۔ اے نبض، اور تیز

عفریتِ ظلم کانپ رہا ہے، اماں نہ پائے
دیوِ فساد ہانپ رہا ہے، اماں نہ پائے

---

(۶۵)

تاخیر کا یہ وقت نہیں ہے دلاورو
آواز دے رہا ہے زمانہ، بڑھو، بڑھو
ایسے میں باڑھ پر ہے جوانی، بڑھے چلو
گرجو مثالِ رَعد، گرج کر برس پڑو

ہاں زخم خوردہ شیر کی ڈہکار، دوستو
جھنکار، ذوالفقار کی جھنکار، دوستو

---

(۶۶)

اے حاملانِ آتشِ سوزاں، بڑھے چلو

اے پیروانِ شاہِ شہیداں، بڑھے چلو

اے فاتحانِ صرصر و طوفاں، بڑھے چلو

اے صاحبانِ ہمّتِ یزداں، بڑھے چلو

تلوار، شمرِ عصر کے سینے میں بھونک دو

ہاں جھونک دو، یزید کو دوزخ میں جھونک دو

---

(۶۷)

دیکھو، وہ ختم ظلم کی حد ہے، بڑھے چلو
اپنا ہی خود یہ وقتِ مدد ہے، بڑھے چلو
بڑھنے میں عزتِ ابِ جد ہے، بڑھے چلو
وہ سامنے حیاتِ ابد ہے، بڑھے چلو

اُلٹے رہو کچھ اَور یوُنہیں آستین کو
اُلٹی ہے آستین تو پلٹ دو زمین کو

۶۸

اے جانشینِ حیدرِ کرّار، المدد

اے منچلوں کے قافلہ سالار، المدد

اے امرِ حق کی گرمیٔ بازار، المدد

اے جنسِ زندگی کے خریدار، المدد

دُنیا تری نظیرِ شہادت لئے ہوئے

اب تک کھڑی ہے شمعِ ہدایت لئے ہوئے

احساسِ لطافت

رقصاں ہے ابر سلسلۂ کوہسار میں
موجِ ہوا میں نغمۂ سوز و گداز ہے
صحنِ چمن میں جلوۂ گلہائے رنگ رنگ
دوشِ صبا پہ نفحۂ زلفِ دراز ہے
ہر ایک برگِ گُل میں ہے وا ایک بابِ رنگ
ہر خار و خس میں ایک درِ حُسن باز ہے
ہر ایک موجِ ابر میں ہے اک خرامِ کیف
ہر ایک شاخِ تازہ میں اک رقصِ ناز ہے

آوازہ آ رہی ہے کہ "اے ناظرِ بہار"
آہستہ سانس لے کہ یہ اِک بزمِ ناز ہے
اے مطربِ سحاب اُٹھا سازِ ادب کے ساتھ
برسات کی یہ خلوتِ راز و نیاز ہے
ہاں چھوڑ اِس خروش کو میٹھے سُروں میں گا
نازک بہت نگارِ لطافت کا ساز ہے
آہستگی کے ساتھ گزر کوہسار سے
ہر سنگ، ایک کارگہہِ شیشہ ساز ہے
ٹھہرے اس انجمن میں وہی رِندِ بادہ خوار
جو مثلِ جوشؔ پاک دل و پاک باز ہے

بیتے ہُوئے دِن

کیا حال کہیں اُس موسم کا
جب جنسِ جوانی سستی تھی
جس پھُول کو چُومو، کھلتا تھا
جس شے کو دیکھو ہنستی تھی،
جینا، سچّا جینا تھا
ہستی، عینِ ہستی تھی
افسانہ، جادُو، افسوں تھا
غفلت، نیندیں، مستی تھی
اُن بیتے دنوں کی بات ہے یہ جب دل کی بستی بستی تھی

(۲)

غفلت، نیندیں، مستی، تھی
آنکھیں کیا، پیمانے تھے
ہر روز جوانی بکتی تھی،
ہر شام و سحر بیعانے تھے
ہر غار میں اِک بُت خانہ تھا
ہر پھول میں سَو میخانے تھے
کالی کالی زُلفیں تھیں
گورے گورے شانے تھے

اُن بیتے دِنوں کی بات ہے یہ جب دل کی بستی بستی تھی

---

(۳)

گورے گورے شانے تھے
ہلکی پھلکی باہیں تھیں
ہر گام پہ خلوت خانے تھے
ہر موڑ پہ عشرت گاہیں تھیں
طغیانِ خوشی کے آنسو تھے
تکمیلِ طرب کی آہیں تھیں
عشوے، چہلیں، غمزے تھے
پیتیں، خوشیاں، چاہیں تھیں

اُن بیتے دنوں کی بات ہے یہ، جب دل کی بستی بستی تھی

رُوپ مَتی

رخسار میں شمعِ کعبہ کی ضَو
آنکھوں میں چراغِ دَیر کی لَو
خوش پیکر و خوش جمال و خوش رُو
چِھٹکی ہوئی چاندنی لبِ جُو
پلکوں کی جھپک میں مُسکراہٹ
شعلے کی خفیف تھرتھراہٹ
برسات کی راگنی کی راتیں
غلطیدہ حَسین دست و پا میں

انفاس میں کمسنی کی خوشبو
بنگال کا ، انکھڑیوں میں جادو
چہرے پہ شباب کا تلاطُم
بُت خانے کی صبح کا تبسّم!
عارض میں دمک، دمک میں ندرت
برسات کے چاند کی لطافت
رس کی بوندیں کہ نرم باتیں
آواز میں مالوے کی راتیں

بھیجا ہے پیامی

اُس کی طرف بھیجا ہے پیامی
رشکِ شاہی، جس کی غلامی
نادِم جس کے رخشِ ادا سے
شُعلہ خِرامی تُند لگامی
قُرباں جس کی موجِ سخن پر
شہد مقالی، نرم کلامی
جس کے ہر اک نقشِ قدم پر
محوِ سجدہ فتنہ خرامی
کاش وہاں سے جوش بہ عجلت
شاد و غزلخواں آئے پیامی

شامِ رخصت

تجھ سے رخصت کی وہ شامِ اشک افشاں، ہائے ہائے
وُہ اُداسی، وہ فضائے گریہ ساماں، ہائے ہائے
وُہ مرے سینے میں سیلِ آب و آتش، الاماں
وُہ ترے چہرے پہ موجِ برق و باراں، ہائے ہائے
وُہ مرا عشقِ گُل افشاں، رشتہ بر پا حیف حیف
وہ ترا حُسنِ جواں، سر در گریباں، ہائے ہائے
وُہ مرے چہرے پہ دُودِ غم کے بادل، الاماں
وہ تری پلکوں پہ اشکوں سے چراغاں، ہائے ہائے

وہ مرے اطوار میں اندازِ سیلِ بے پناہ
وہ تری آواز میں آثارِ طوفاں، ہائے ہائے
وہ جدائی کی ہوا کے تُند جھونکے وائے غم
وہ جوانی کا چراغِ زیرِ داماں، ہائے ہائے
اس طرف اُلجھی ہوئی موجِ حیاتِ یک نفس
اُس طرف بکھرے ہوئے گیسوئے تاباں، ہائے ہائے
اِس طرف تاریکیٔ شامِ مریضانِ کہن
اُس طرف آلامِ صبحِ سوگواراں، ہائے ہائے
طاقِ عبرت، اور میری شمعِ ہستی، حیف حیف
ہالۂ غم، اور تیرا ماہِ تاباں، ہائے ہائے
یاں چمکنے ہی پہ برقِ نالۂ درد آفریں
واں برسنے ہی پہ ابرِ چشمِ حیراں، ہائے ہائے

یاں، ہر اک تارِ نظر — زنجیرِ پائے عافیت
واں، ہر اک موجِ نفس — دیوارِ زنداں ہائے ہائے

یاں لبوں پر جنبشِ آہِ تنک جاں، وا نصیب
واں، مژہ میں لرزشِ اشکِ گریزاں ہائے ہائے

حسرتِ دیدار، یاں ہر آن بیتاب و شدید
فرصتِ نظّارہ واں پیہم پَرافشاں ہائے ہائے

یاں، لرزتا سا غرورِ عزم و ہمّت، الحذر
واں جھجکتی سی نگاہِ فتنہ ساماں، ہائے ہائے

یاں، کفِ پا چوم لینے کی بھچی سی آرزو
واں، بغل گیری کا شرمایا سا ارماں، ہائے ہائے

تمتماتے ولولوں کی آگ، اور تیری جبیں
سنسناتی آنچ، اور میرا گلستاں، ہائے ہائے

مَیں سَراپا سازِ عشرت، اور رہینِ درد و غم
تو مجسّم نازکی، اور بارِ حرماں، ہائے ہائے

وہ مِیری نظروں میں کچھ کہنے کی حسرت وائے شوق!
وہ تِری نظروں میں کچھ سُننے کا ارماں، ہائے ہائے

اللہ اللہ آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ کہنا ترا
"جوشؔ، میرا دل ہُوا جاتا ہے ویراں، ہائے ہائے"

اے فغاں بر لب ترنّم، اے خزاں بر کف بہار
جوشؔ تیرے دل کی ویرانی کے قرباں، ہائے ہائے

بسنتی اتحاد

ساقی! ساغر اُٹھا، خدارا
سرسوں پھُولی، بسنت آیا
سردی— گرمی سے مِل رہی ہے
سینوں میں کلی سی کھِل رہی ہے
بھر کر قدحِ شراب رکھ دے
آ، بزم میں آفتاب رکھ دے
خونِ موسم میں ہے روانی
برسا دے شرابِ ارغوانی

پیاسے ہیں بہت ترے شرابی
ہاں طاق سے جلد اٹھا گُلابی

سردی کے مزاج میں ہے نرمی
نرمی میں ہے دلبرانہ گرمی

تسکین کے بیج بو رہی ہے
موسم کو ہوا سمو رہی ہے

جس لُطف سے مل رہے ہیں موسم
مِل جائیں خدا کرے یونہیں ہم

آ، لُطف کے وہ نکال پہلُو
مسلم باقی رہے، نہ ہندُو

بَس جائے ہر ایک دل کی بستی
مذہب ہو فقط وطن پرستی

اچھی نہیں ہائے ہائے ساقی
باجا ہی رہے نہ گائے ساقی
مِل جُل کے فسانہ خوانیاں ہوں
ہر سانس میں سَو جوانیاں ہوں

پست قوم

اپنے خلاف بات سُنیں، اور خوش رہیں
ذہنوں میں وہ طہارت و وسعت کہاں ہے جوشؔ
جلتی ہے کوہ و بحر کو جو رَوندتی ہُوئی
اہلِ جُمود میں وہ محبّت کہاں ہے جوشؔ
اپنی اِہانتوں کا کچُھ احساس کر سکیں
اِتنا، دلوں میں جذبۂ غیرت کہاں ہے جوشؔ
تیزیِ شراب تُند کو برداشت کر سکے
اِس مُلک میں وہ ظرف، وہ قوت کہاں ہے جوشؔ

ہم شاعروں کی وضعِ جنوں کے اٹھائیں ناز
اہلِ وطن میں اتنی شرافت کہاں ہے جوشؔ
اہلِ نظر کی قدر کریں حسبِ مدّعا
ابنائے ملک میں وہ بصیرت کہاں ہے جوشؔ
گردن کا طوق، پاؤں کی زنجیر کاٹ دے
اتنی، غلام قوم میں ہمّت کہاں ہے جوشؔ
اپنی تباہیوں پہ کبھی غور کر سکے
اتنی، ذلیل ملک کو فرصت کہاں ہے جوشؔ
اک حرفِ گرم سنتے ہی لَو دے اُٹھیں دماغ
ہندوستان میں وہ حرارت کہاں ہے جوشؔ

مرے لئے

کیونکر نہ زندگی ہو سعادت مرے لئے
ہر جنبشِ نظر ہے، عبادت مرے لئے

اسماء پہ ہے نگاہ، نہ اشکال پر نظر
یعنی مجاز بھی ہے حقیقت مرے لئے

ظاہر کروں تو کفر کے فتوے لگائے خلق
اُتری ہے چرخ سے وہ شریعت مرے لئے

کہتے ہیں عرفِ عام میں جس شے کو وقتِ نحس
وہ بھی ہے اِک نشانِ سعادت مرے لئے

ہر داغِ دل ہے اک چمنستاں مرے حضور
ہر ضربِ غم ہے ایک بشاشت مرے لئے
ہر آن ہے نزولِ ملائک مرے حضور
ہر سانس ہے نویدِ رسالت مرے لئے
اپنے ضمیرِ زندہ و خلّاق کی قسم
اِک حرفِ پوچ ہے بشریّت مرے لئے
تابندہ جس مقام پہ ہے وجہِ ذوالجلال
مختص ہے وہ فرازِ بصیرت مرے لئے
ہر شب کو، شمعِ راز لئے، رُوحِ کائنات
لاتی ہے ایک تازہ بشارت مرے لئے
جس کی چمک سے جیبِ مشیّت ہے تابناک
مخصوص ہے وہ گوہرِ حکمت مرے لئے

حُسنِ مخمُور

الاماں، پھر وہ نگاہِ مست، غرقِ ناز ہے
انکھڑیوں میں نغمہ ہے، دستِ مژہ میں ساز ہے

ہو رہی ہے صُبح، پھر بھی رُخ پہ ہے شب کا سُرور
انتہا میں ابتدا۔ انجام میں آغاز ہے

اللہ اللہ، قامتِ بالا کا بے پایاں غرور
عرش و کُرسی کی بلندی، فرشِ پا انداز ہے

اِس طرف چلتا نہیں بس، لغزشِ مستانہ سے
اُس طرف چتون میں خوفِ انکشافِ راز ہے

کاکلیں رَہ رَہ کے یوں لہرا رہی ہیں دوش پر
تُو کہے، ببلائے شب، آمادۂ پرواز ہے
بستۂ ذوقِ سماعت ہے نظامِ کائنات
انکھڑیوں میں یوں درِ حرف و حکایت باز ہے
زلف کی ژولیدگی ہے، راویٔ طوفانِ شب
سُرخیٔ لب، مستیٔ دوشینہ کی غمّاز ہے
کیوں نہ غلطاں ہوں کلامِ جوؔش میں رنگینیاں
جوؔش، طفلی سے ہے رند، اور رندِ شاہد باز ہے

خود تسلّی

پھر نظر آئے گی وہ آشوبِ دوراں، صبر کر
صبر کر، اے آرزوئے دیدِ جاناں، صبر کر

پھول پھر کھل جائیں گے اک روز، یوں مضطر نہ ہو
شمع خود ہو جائے گی اک دن فروزاں، صبر کر

ایک دن کٹ جائینگی خود بیڑیاں، آہیں نہ بھر
ایک دن کھل جائیگا خود قفلِ زنداں، صبر کر

پھر وہی ہونگی شمیمِ زلف کی گلکاریاں
پھر وہی ہوگی نسیمِ سنبلستاں، صبر کر

تیرے ہی حِصّے کا ہے وہ حُسنِ رنگیں دم تو لے
تیری ہی قسمت میں ہے وہ راحتِ جاں صبر کر

ہاں صباحِ کوہساراں کی تجلّی کی قسم
چھٹنے ہی والا ہے ابرِ شامِ ہجراں، صبر کر

اِن ترے اُجڑے ہوئے نشانوں پہ پھر، لہرائے گی
اُس سراپا ناز کی زُلفِ پریشاں صبر کر

شُکّریں اُس لب سے ہوگا پھر ترا کام و دہاں
برہ بنائے تلخیٔ صبر فراواں، صبر کر

ہاں اِسی خلوت میں اک دِن بے محابا، یک بیک
حُسن در آئے گا رقصاں و غزلخواں، صبر کر

ہاں کسی شب دفعتہً اِس حجرۂ تاریک میں
پھر جھلک اُٹھیگی اُس ماتھے کی افشاں، صبر کر

تیرگی ہے خود نویدِ روشنی، غمگیں نہ ہو
شام ہے خود وعدۂ صبحِ درخشاں، صبر کر
اِک نہ اِک دن جوشِ اِس در سے بربِ رنگ و بو
گنگناتی آئے گی روحِ بہاراں، صبر کر

امانی گنج[1] کا باغ

آم کا باغ جو ہے پیشِ نظر
یہ مِرے باپ نے لگایا تھا
یاد ہے، خوب یاد ہے کہ یہاں
ایک روز اُن کے ساتھ آیا تھا
باغ کے پاسباں نے بہرِ سلام
ہات اُٹھایا تھا، سر جھکایا تھا
کِس قدر جاں فزا ہوائیں تھیں
کس قدر دل فریب سایا تھا

[1] امانی گنج، ملیح آباد کا وہ میدان جہاں مصنف کا مکان ہے۔

پتّے پتّے پہ نوجوانی تھی
ذرّے ذرّے پہ رنگ چھایا تھا

خستہ چڑیوں کے چہچہانے سے
شام کا وقت گنگنایا تھا

میرے اِک بار مُسکرانے پر
باغ سو بار مُسکرایا تھا

دِل پہ اب تک خراش باقی ہے
دو گھڑی کو وہ لُطف آیا تھا

اور آیا ہوں میں جو آج یہاں
باغ ہنستا، نہ مُسکراتا ہے

کل تو گایا تھا، گنگنایا تھا
اب نہ گاتا، نہ گنگناتا ہے

اب کوئی پاسباں، پئے تسلیم
ہات اُٹھاتا، نہ سر جُھکاتا ہے

بلکہ ہر غنچہ اب مری جانب
آنکھ بیگانہ وار اٹھاتا ہے

باغ کب کا چھُٹ چکا ہے جو دور
مجھ کو رہ رہ کے یاد آتا ہے

یادِ ماضی ——— ارے معاذ اللہ
دل، تڑپتا ہے، بیٹھ جاتا ہے

آہ بیتے دنوں کی یاد کا غم
زندگی کو لہو رُلاتا ہے

صرف اک بار مسکرا دینا
دل پہ سَو بجلیاں گراتا ہے
کیا کہوں، کس قدر مرے دل کو
نوعِ انساں پہ رحم آتا ہے
جانتا ہے فریب ہے ہستی
پھر بھی ناداں فریب کھاتا ہے

دیدنی ہے آج

پہلو میں تابِ حُسنِ جواں، دیدنی ہے آج
نُورِ چراغِ خلوتیاں، دیدنی ہے آج

کشتی رواں ہے نغمۂ ساقی کی لَے کے ساتھ
موجِ خرامِ آبِ رواں، دیدنی ہے آج

دمسازِ ابر و باد ہے رندانہ بانکپن
طرفِ کلاہِ پیرِ مغاں، دیدنی ہے آج

آرائشوں کی فکر، نہ زیبائشوں کا ہوش
وارفتگیٔ لالہ رُخاں، دیدنی ہے آج

حُسنِ جواں، شرابِ کہن، سازِ برشگال
عشرت سرائے بادہ کشاں، دیدنی ہے آج

اے امیرِ جہل پناہ

تجھے یہ علم بھی ہے اے امیرِ جہل پناہ؟
کہ مَیں ہوں لیلیٔ اسرارِ دہر کا محرم
تری زمیں بھی غلط، آسمان بھی باطل
وہ ایک ذرّہ، تو یہ ایک قطرۂ شبنم
ترے جہانِ تمنّا میں فکرِ سُود و زیاں
مرے دیارِ خیالات میں نہ کیف نہ کم
مرے ضمیر میں انوارِ یوسفِ کنعاں
مرے کلام میں انفاسِ عیسیٰ مریم
"گدائے میکدہ ام، لیک وقتِ مستی بیں
کہ ناز بر فلک و حُکم بر ستارہ کنم" (حافظ)

خلوتیِ اسرار کو اربابِ عقل کی دعوت

اے خلوتیٔ حجلۂ اسرار و معانی
تسبیح سے تحقیق کے دربار میں آ جا

اے پردہ نشینِ حرمِ عصمت و ایماں
اک روز تو رندانِ گنہگار میں آ جا

ممکن ہو تو وجدان کی محفل سے نکل کر
اے شاہدِ جاں، حلقۂ افکار میں آ جا

اک عمر سے حیران و پریشاں ہیں خریدار
اے جنسِ گراں عقل کے بازار میں آ جا

قرنوں سے ہیں اربابِ نظر گوش بہ آواز
اے رازِ نہاں معرضِ گفتار میں آ جا

ریل کی پٹریاں

(۱)

کتنے اہلِ جہاں کے وہم و گماں
کتنی نقاشیِ زمان و مکاں
کتنی اہلِ نشاط کی خوشیاں
کتنے جلتے ہوئے دلوں کا دھواں
کتنے سیلاب، کس قدر طوفاں

ریل کی پٹریوں میں ہے غلطاں

(۲)

کتنی شر و فساد کی باتیں
کتنی جنگ و قتال کی گھاتیں
کتنے تاریک دن، سیہ راتیں
کتنی سہمی ہوئی ملاقاتیں
کس قدر دیو، کس قدر شیطاں

ریل کی پٹریوں میں ہے غلطاں

---

(۳)

کتنے افکار، زندگانی کے
کتنے ارمان، شادمانی کے
ولولے کتنے کامرانی کے
حوصلے کس قدر جوانی کے
کتنی مقدارِ ہمّتِ انساں

ریل کی پٹریوں میں ہے غلطاں

---

(۴)

کتنی موجوں کے نو بہ نو گرداب

کتنے خطّوں کے مختلف آداب

کتنے مُلکوں کے گوہرِ نایاب

کتنی قوموں کے واقعاتِ شباب

کتنے باغوں کے سنبل و ریحاں

ریل کی پٹریوں میں ہے غلطاں

---

(۵)

بدلیاں کتنی شادمانی کی
کتنی راتیں فسانہ خوانی کی
کتنی نیندیں نئی جوانی کی
کتنی دھومیں برستے پانی کی
کس قدر برق، کس قدر باراں

ریل کی پٹریوں میں ہے غلطاں

(۶)

کتنی شمعوں کے مُردہ پروانے
کتنے بھُولے ہوئے غمِ افسانے
کتنے افسردہ ماتمی گانے
کتنے خالی دلوں کے ویرانے
کتنی آنکھوں کے اشک ہائے رواں

ریل کی پٹریوں میں ہیں غلطاں

---

(۷)

کتنی آنکھوں کا بے صدا غوغا
کتنے چہروں کی دردناک صدا
کتنا رس اجنبی نگاہوں کا
کس بلا کا تغافلِ پیدا
کس غضب کا تلطّفِ پنہاں

ریل کی پٹریوں میں ہے غلطاں

---

(۸)

کتنی ہی تابشیں نگینوں کی
کروٹیں کتنے مہ جبینوں کی
کتنی انگڑائیاں حسینوں کی
کتنی آنچیں جوان سینوں کی
کتنے ہاتھوں کی سُرخیٔ افشاں

ریل کی پٹریوں میں ہے غلطاں

نقشِ دوام

روپ سنگھ، اے رندِ خوش اوقات و یارِ دل نشیں[1]
میں ترے احسان، مر کے بھی بھلا سکتا نہیں
تُو نے کیا کیا ناز اٹھائے ہیں مرے جذبات کے
اے ستونِ روشنی، میری اندھیری رات کے
شاعری جب تک رہے گی موجبِ کیف و سرور
شعر کا جب تک رہے گا نسلِ آدم کو شعور
جب تلک پیمانہ و ساقی رہے گا دہر میں
روپ! تیرا نام بھی باقی رہے گا دہر میں
غیر ممکن ہے کہ ہو تجھ تک رسائی موت کی
موڑ کر رکھ دی ہے میں نے یوں کلائی موت کی

---

[1] سردار روپ سنگھ۔ دھول پور۔ افسوس کہ نے معلوم تھا کہ یہ نظم اُس یارِ عزیز کے انتقال کے بعد شائع ہو گی۔

رہروانِ ملکِ عدم سے[1]

(۱)

اے سینۂ آفاق کے ٹوٹے ہوئے چھالو!

اے راہ روؤ، راہ روؤ، باگ سنبھالو!

ہاں مُڑ کے ذرا ایک نظر مجھ پہ بھی ڈالو!

میری بھی رہائی کی کوئی شکل نکالو!

اپنی ہی طرح موت کے دامن میں چھپالو

اے قافلے والو!

---

[1] سردار روپ سنگھ مرحوم کے انتقال پر یہ نظم جذبۂ غم کی انتہائی شدت میں کہی گئی تھی۔ ہچکیوں اور آنسوؤں کے ساتھ۔

(۲)

گونجی ہوئی آفاق میں آوازِ فغاں ہے

یوں ماتم سر حلقۂ رنداں جہاں ہے

ہر آنکھ سوئے مرگ بہ حسرت نگراں ہے

للّٰلہ بتاؤ تو مرا "روپ" کہاں ہے

جِس سمت ہے وہ مجھکو بھی اُس سمت بُلالو

اے قافلے والو!

(۳)

کہتے ہیں مرا "روپ" گیا دُور — بہت دُور
رہتا تھا جو آنکھوں میں ہوا خاک میں مستور
بیزار ہوں جینے سے مجھے موت ہے منظور
امداد کی دو بھیک کہ ہُوں بندۂ مجبور

اک بندۂ مجبور کا ارمان نکالو
اے قافلے والو!

---

(۴)

گزروں بھی تو کس طرح جہانِ گزراں سے
لاؤں بھی تو اب قوّتِ رفتار کہاں سے
اَب زور رہی دل میں نہیں فریاد و فغاں سے
اب ایک قدم بھی نہیں اُٹھتا ہے یہاں سے

دل سے نہ سہی، پاؤں کے کانٹے ہی نکالو
اے قافلے والو!

---

(۵)

ہوگا کوئی مجھ سا بھی نہ اندوہ رسیدہ
در گلشنِ من یک گلِ عشرت نہ دمیدہ
"گرگِ دہن آلودہ و یوسف ندریدہ"
مَیں کب سے پڑا ہوں صفتِ اشک چکیدہ
ممکن ہو اگر، خاک سے مجھ کو بھی اُٹھالو
اے قافلے والو!

(۶)

خاموش ہواؤں کا ہے خاموش ترانہ

ہمراہ زمانے کا فسوں ہے، نہ فسانہ

آوازِ رحیل اور نہ گُل بانگِ چغانہ

ہاں موت کے ناقوں پہ ہو تم لوگ روانہ

اِن میں سے کسی ایک پہ مجھ کو بھی بٹھا لو

اے قافلے والو!

مہاجن اور مفلس

مہاجن

قد کی لمبائی سے اک حد تک کمر جھولی ہوئی
سر پہ چُٹیا، مُردہ چوہے کی طرح پھولی ہوئی
دانت میلے، پنڈلیاں پیچیدہ، دھوتی داغدار
ناک میں مونچھوں کے گوبجے، پیٹ میں توندی کا غار
سامنے غلّے کے بورے، پُشت پر الماریاں
بُغبُغوں میں کروٹیں لیتی ہوئی زرداریاں
کُہنیاں تکیے کے اندر، وزن سے دھنستی ہوئی
چُست صدری، دائرے پر توند کے پھنستی ہوئی

خوب لے لے کر ڈکاریں، دل کو بہلاتا ہوا
دونوں نتھنوں کو پھلائے، توند سہلاتا ہوا
ہنس کے غوطے، آبِ سرد و گرم میں دیتا ہوا
قرض کے طالب کے دل کا امتحاں لیتا ہوا
عذر کرتا پَیے بہ پَیے، تیوری چڑھاتا بار بار
شدّتِ حاجت کا اندازہ لگاتا بار بار
کشتیِ ہستی کو جُوئے سیم میں کھیتا ہوا
اُلٹی سانسیں، فربہی کے بار سے، لیتا ہوا
رُخ کی تاریکی پہ زر کی سُرخیاں چھائی ہوئی
بے حقیقت خاک سونا بن کے اترائی ہوئی
کان کے بالے، نمودِ زر کا دم بھرتے ہوئے
سُود کے بارے میں کچھ سرگوشیاں کرتے ہوئے

عالمِ اخلاق کو زیر و زبر کرتا ہوا
بے زری کی شام سے اخذِ سحر کرتا ہوا

مُفلس

ضُعف سے آنکھوں کے نیچے پتلیاں پھرتی ہوئی
اَوجِ خود داری سے دل پر بجلیاں گرتی ہوئی
لاش کاندھے پر خود اپنے جذبۂ تکریم کی
مُلتجی چہرے پہ لہریں سی اُمید و بیم کی
عزّتِ اجداد کے سر پر دَما دم ٹھوکریں
رشتۂ آواز پر لفظوں کی پیہم ٹھوکریں
چہرۂ افسردہ پر ٹھنڈا پسینہ شرم کا
سُست نبضیں بھیک کا لہجے کے اندر ٹھیکرا

قرض کی درخواست کی اُلجھی ہوئی تقریر میں
کپکپی اعصاب کی، بیچین دل کی لرزشیں
اِک طرف حاجت کی شدت، اک طرف غیرت کا جوش
نُطق پر حرفِ تمنا، دل میں غصّے کا خروش
جُنبشِ مژگاں کے زیرِ سایۂ ناداری کی رات
جوہرِ انسانیت، جوڑے ہوئے آنکھوں میں ہات
سانس، دہشت سے زمیں کی آسماں روکے ہوئے
مفلسی، مردانہ لہجے کی عناں روکے ہوئے
لب پہ خشکی، رُخ پہ زردی، آنکھ شرمائی ہوئی
چشم و ابرو میں خودی کی آگ کجلائی ہوئی
نفس میں شیرانہ تیور، آرزو، رُوبہ مزاج
احتیاج و احتیاج و احتیاج و احتیاج!

سیّال عکس

صبح، چونکا ایک بوڑھا آدمی نزار و نزار
صحن میں دیکھا بہو بیٹھی ہوئی ہے سوگوار
سر سے لے کر پاؤں تک اِک پیکرِ اندوہگیں
لب پہ خشکی، ران پر کہنی، ہتھیلی پر جبیں
کمسنی پر روح فرسا بیوگی چھائی ہوئی
نوجوانی کو، فسونِ غم سے نیند آئی ہوئی
دیکھ کر سوتے فلک بوڑھے نے کھینچی آہِ سرد
اس طرح جھپکائیں پلکیں اڑ رہی ہو جیسے گرد

جی بھر آیا، قلب کانپا، روح تھرّانے لگی
یک بیک بیٹے کے سہرے کی مہک آنے لگی
بھاپ اُٹھی یوں دل سے، نقشہ کھنچ گیا فرزند کا
چشمِ تر میں عکس کانپا بے نشاں دل بند کا
عکس، پہلے تو خدا معلوم کیا کہنے لگا
باپ کے چہرے پر آنسو بن کے پھر بہنے لگا

ہنوز

سُن کہ آئینۂ آغاز ہے انجام ہنوز
دل میں نشتر سا کھٹکتا ہے ترا نام ہنوز

تیری جانب سے نہ نامہ ہے نہ مدّت سے پیام
اور یہاں ہے خلشِ نامۂ و پیغام ہنوز

ہو چکی ہے ترے گھر صبحِ سعادت طالع
اور مرے خانۂ تاریک میں ہے شام ہنوز

تجھ میں اب ولولۂ عیش و طرب ہے بیدار
اور یہاں غم پہ مُصر ہے دلِ ناکام ہنوز

تیرے خلوت کدۂ ناز میں ہے چنگ و رباب
اور یہاں بزمِ تمنّا میں ہے کہرام ہنوز

حسبِ اوقات مقرّر ہے ترا رامش و رنگ
اور یہاں ایک ہے رنگِ سحر و شام ہنوز
پختہ کاری ہیں گرفتار ہے اب عقل تری
اور یہاں دل ہے اسیرِ ہوسِ خام ہنوز
رنگ چہرے کا اُڑاتا ہے ترا ذکر اب تک
نیند آنکھوں سے چُراتا ہے ترا نام ہنوز
اب تری شمع ہے اور خلوتِ محرابِ حرم
یاں چراغاں ہے سر رہگزرِ عام ہنوز
تجھ کو اک عمر ہوئی بندِ وفا سے چھوٹے
جانِ محزوں ہے یہاں مرغِ تہِ دام ہنوز
پھر سے کھوئی ہوئی توقیر کے پانے والے
دیکھ، تحقیر کے شایاں ہے مرا نام ہنوز

اَب ترے سَر پہ نہیں ابرِ ملامت کی گرج
اور مَیں ہُوں ہدفِ ناوکِ دُشنام ہنوز
خارج از بحث ہے اب تیرا گناہِ اُلفت
اور محبّت کا، مِرے دل پہ ہے الزام ہنوز
ہو چکی ہے تری ناکردہ گناہی ثابت
اور مِرے جُرم کا ہے غُلغُلۂ عام ہنوز
داد دے اے مِرے نو واردِ شہرِ ناموس
جوشِش ہے کوچہ و بازار میں بدنام ہنوز

خبردار اے دل!

خطرناک ہے حُسنِ بازار، اے دل
یہ صحت کا پیکر ہے بیمار، اے دل
دہکتے ہیں ہر چند رُخسار، اے دل
مگر یہ ہیں تاریکِ انوار، اے دل

یہ کاذبِ سحر ہے شبِ تار، اے دل
خبردار اے دل، خبردار اے دل

(۲)

یہ عبرت کی محفل ہے عُسرت کی منزل
معاذ اللہ! اس نخبہ کا حُسن محمل
اگر دُور ہے تو مسیحا مماثل
جو نزدیک آئے تو سفّاک و قاتل

اسے بھُول کر بھی نہ چمکار اے دل
خبردار اے دل، خبردار اے دل

---

(۳)

تنعّم میں اِس کے ہے ادبار پنہاں
اداؤں میں ہے نرخِ بازار پنہاں
مہکتے نفس میں ہیں آزار پنہاں
لچکتی کمر میں ہے تلوار پنہاں

جو شہ رگ اُڑا دے، وہ تلوار اے دل
خبردار اے دل، خبردار اے دِل

---

(۴)

نہ کھا! دیکھ، موجِ تبسّم کا دھوکا
یہ ہلچل میں ہے سیم و زر کی تمنّا
یہ نغمے کہ تو دل سے جن پر ہے شیدا
یہ سِکّوں کی جھنکار کا ہے تقاضا

تقاضے — بتا دے جو نادار اے دل
خبردار اے دل، خبردار اے دل

---

(۵)

بظاہر محبّت، بباطن ستم ہے

جو دیکھو تو امرت، جو چکھ لو تو سَم ہے

یہ نازک سے پیکر میں جو پیچ و خم ہے

تشنّج یہ در اصل بہرِ درم ہے

تشنّج میں ہے جُنبشِ مار، اے دل

خبردار اے دل، خبردار اے دل

---

(۶)

ترا گریۂ مستقل کچھ نہیں ہے
ترا چہرۂ مضمحل کچھ نہیں ہے
تری اُلفتِ مشتعِل کچھ نہیں ہے
کہ یاں جیب سب کچھ ہے دل کچھ نہیں ہے

یہ گاہک ہے زر کا خبردار اے دل
خبردار اے دل، خبردار اے دل

---

(۷)

حماقت ہے اِس حسن پر جان دینا
سفینہ اِس آبِ تنک میں نہ کھینا
کہ یہ بحرِ امراض و غم کا ہے پھینا
کہیں چکھ نہ لینا، کہیں چھو نہ لینا

یہ موجیں ہیں سیّال آزار اے دل
خبردار اے دل، خبردار اے دل

۸

نہ گا، حسنِ بازار کے راگ، ناداں
یہ پانی نہیں، آگ ہے آگ، ناداں
یہ کاکُل نہیں، ناگ ہے ناگ، ناداں
ارے بھاگ ناداں! ارے بھاگ ناداں

وہ رینگا ارے ناگ ہشیار اے دل
خبردار اے دل، خبردار اے دِل

حیّ علیٰ خیرِ العمل

آ ، ہمنشیں ، نمازِ صبوحی ادا کریں
خوشبوئے عُود میں درِ میخانہ وا کریں
ہاں اُٹھ کہ مہرِ شیشۂ گل رنگ توڑ کر
انسانیت کو دامِ خرد سے رہا کریں
باقی جو بچ رہا ہے کچھ ایمانِ 'خیر' سے
اُس کو بھی آج پائے صنم پر فدا کریں
پودے مچل رہے ہیں، گھٹائیں ہیں پُرخروش
آ، ہم بھی آج حقِّ جوانی ادا کریں

بہکیں قدم قدم پہ، چلیں جھوم جھوم کر
اتنا تو پاسِ خاطرِ موجِ صبا کریں
ساغر میں غرق کر کے لباسِ فریب کو
پیرانِ خرقہ پوش کے حق میں دُعا کریں
ہر شے ہے پائے لیلیٰ مستی پہ سجدہ ریز
اور ہم نمازِ جام و صراحی قضا کریں!
برسات کی گھٹاؤں سے برسیں گلابیاں
اور ہم وضو سے شستہ و شوئے دست پا کریں
گلشن کا ذرّہ ذرّہ پیتے بے دھڑک شراب
اور ہم خیالِ پرسشِ روزِ جزا کریں!
بہکے ہوا، رواں ہو فضا، مست ہو گھٹا
اور ہم خرد کو راہبر و رہنما کریں!!

گردوں پیالہ کش ہے، تو گیتی قرابہ نوش
ہم اور اس بہار میں خوفِ خدا کریں
پی پی کے جھوم جھوم کے، گا گا کے مثلِ جوش
آ، دھوم سے عبادتِ آب و ہوا کریں

بوڑھے نوجوان

اے مرے ہندوستاں کے مردہ خصلت نوجواں
تیرے خال و خط میں پیری کے نشاں پاتا ہوں میں
تیرے بے سالار، اندھے کارواں کی راہ میں
ہر قدم پر اک بلائے ناگہاں پاتا ہوں میں
جس کو تو سمجھے ہوئے ہے ایک بے پایاں عروج
اُس کو تمہیدِ زوالِ بیکراں پاتا ہوں میں
سخت حیراں ہوں کہ اے ناداں بہ ایں افلاس و جہل
تجھ کو مشتاقِ شرابِ ارغواں پاتا ہوں میں

تیرے مستقبل کی جانب جب اُٹھاتا ہوں نگاہ
چہرے پر اُڑتی ہوئی کچھ دھجیاں پاتا ہوں میں
دوشِ آبا پر تری ہستی کو اے ننگِ حیات
جو نہ اُٹھ سکتا ہو وہ بارِ گراں پاتا ہوں میں
حیف تیری نوجوانی پر ہیں پیری کے نشاں
دوسری قوموں کے بوڑھوں کو جواں پاتا ہوں میں
زندہ قوموں کے جواں ہیں چہرۂ آبا کا رنگ
اور تجھے روئے پدر کی جھرّیاں پاتا ہوں میں
آگ بجھ جائیگی، چھاتی سرد و نم ہو جائیگی
چونک! ورنہ زندگی کی پُشت خم ہو جائے گی

رِندِ ہزار شیوہ

ہمنشیں مجھ کو لرزتے ہوئے آگاہ نہ کر
کہ بلا خیز حوادث کی نظر ہے مجھ پر
ہاں میں واقف ہوں کہ اوہامِ زبوں کے فرزند
پھینکنا چاہ رہے ہیں مرے قلعے پہ کمند
میری آواز سے ہے رُوحِ قدامت کو عناد
میرے افکار سے آشفتہ ہیں اربابِ فساد
ہاں مری جان کے دشمن ہیں خیالاتِ عقیم
ہاں مرے خون کے پیاسے ہیں روایاتِ قدیم

جن پہ اک عمر سے تقلید کا نازل ہے عتاب
وہ مجھے کافر و زندیق کا دیتے ہیں خطاب
مَیں نے خورشیدِ حقائق کو جو چمکایا ہے
خوں، اَوہام کی آنکھوں میں اُتر آیا ہے
ہاں مَیں واقف ہوں کہ برگشتہ ہیں مجھ سے وہ عوام
جن کے افکار کو یرقان ہے، عقلوں کو جذام
جن کا اِدراک، تعفّن سے غذا پاتا ہے
جن کو بوئے گل و نسریں سے بخار آتا ہے
بھونکتے ہیں مرے افکار پہ وہ خانہ خراب
خود کو "علاّمہ" و "شاعر" کا جو دیتے ہیں خطاب
مسلکِ عذر کا ہر سالکِ بیہودہ مزاج
میری آزاد روِش سے ہے برافروختہ آج

مشورے ہیں مری تخریب کے گمراہوں میں
کتنے بزدل ہیں کہ بیٹھے ہیں کمینگاہوں میں
ہاں، وہ کہتے ہیں مجھے بادہ کش و نامہ سیاہ
جن میں باقی نہیں اب جرأتِ رندیٔ و گناہ
ہاں، سیاست کو بھی کچھ بغض نہیں کم مجھ سے
طُرّۂ افسرِ شاہی بھی ہے برہم مجھ سے
ہاں، مری سمت ہے، تقدیر سے دونوں کی نگاہ
خواہ وہ محتسبِ شہر ہو، یا شحنۂ شاہ
شیر ہی مجھ سے پریشاں نہیں، رُوباہ بھی ہے
"شاہ صاحب" بھی مری فکر میں ہیں "شاہ" بھی ہے
تُو، مگر خوف دلاتا ہے عبث، یارِ حبیب
پھر تو دہرا کہ "تری موت کی ساعت ہے قریب"

زندہ ہیں موت کے دھارے پہ ہیں اُبھرنے والے
موت کے نام سے ڈرتے نہیں مرنے والے
موت کا جام ہے صہبا کی صُراحی مجھ کو
موت کے نام سے آتی ہے جماہی[1] مجھ کو
رُوح ہے مجھ میں صعوبت کے پرستاروں کی
نشّہ ہوتا ہے مجھے چھاؤں میں تلواروں کی
برسوں جھولا ہوں اُن اجداد کے گہواروں میں
صُبح مُنہ دیکھتے تھے اُٹھ کے جو تلواروں میں
تیغِ خوں ریز سے بڑھ چڑھ کے تھے ابرو جن کے
تیر سینوں ہی میں ہوتے تھے ترازو جن کے
جانتا ہی نہیں درماندۂ و حیراں ہونا
کھیل ہے، غم سے مجھے دست و گریباں ہونا

[1] میں اس قسم کے قوافی کو درست سمجھتا ہوں

سیرِ گلزار ہے، شعلوں کا بھڑکنا مجھ کو
لحنِ شیریں ہے کمانوں کا کڑکنا مجھ کو
اپنے تابندہ روایات کی کھاتا ہُوں قسم
زہر، امرت ہے مرے حق میں، جراحت مرہم
رقص کرتا ہوں مَیں چلتی ہوئی تلواروں پر
نیند آتی ہے دَہکتے ہوئے انگاروں پر
اُس کو کیا خوف ہو چلتی ہوئی تلواروں سے
مُدتوں کھیل چکا ہو جو طرحداروں سے
اب مصیبت ہے مصیبت کا نہ ہونا مجھ کو
کر دیا عشق کی نرم آنچ نے سونا مجھ کو
ہوں، اگر دَہر میں آثار ہیں پیکاروں کے
زخم ہیں دل پہ مرے حُسن کی تلواروں کے

ہوں، اگر حشر ہیں دُنیا کے بَلا خانے میں
ایسے ٹکڑے ہیں بہت سے مرے افسانے میں
کیا بھلا خوف ہیں کانٹوں کے گرفتار ہوں میں
جس کو پھُولوں نے ڈسا ہے وُہ دل افگار ہوں میں
موجِ صرصر سے ڈراتا ہے اُسے تو بیکار
پھُونک چکا ہے جو نسیمِ سَحَری سے سو بار
اُس کو شعلوں سے ڈراتا ہے کوئی اے ہمدم
نوجوانی میں جسے پھُونک چکی ہو شبنم
قہرِ یاراں کو سمجھتا ہے وہ از قسمِ نیاز
مہرِ خوباں کا جو مقتول ہے اے محرمِ راز
تیغِ دُشمن سے جواں مَرد بھی ڈرتے ہیں کہیں
خنجرِ دوست کے مارے ہوئے مرتے ہیں کہیں

بحر میں آگ لگاتی ہے کہانی میری
گرمیٔ برق پہ ہنستی ہے جوانی میری

کتنے گرداب میں دیکھے ہیں کنارے میں نے
کتنے کاٹے ہیں مچلتے ہوئے دھارے میں نے

کتنے ادیان کی موڑی ہے کلائی میں نے
کتنے اصنام کو بخشی ہے خدائی میں نے

شوق نے پاؤں سے مسلی ہیں وبائیں کیا کیا
عشق نے ہجر کی جھیلی ہیں بلائیں کیا کیا

کتنا اُلجھا ہوں تڑپتے ہوئے ارمانوں سے
کتنا کھیلا ہوں اُمنڈتے ہوئے طوفانوں سے

خوفِ جاں ہی نہیں ہر خوف پہ خنداں ہوں میں
اک رہا خوفِ "خدا" خیر، مسلماں ہوں میں

پوچھ، دم بھرتا ہے کب سے مری مدّاحی کا
تجربہ، مملکتِ حُسن کی سیّاحی کا
مانتی ہیں سفرِ صعب کی گھاتیں مجھ کو
خوب پہچانتی ہیں خوف کی راتیں مجھ کو
کب سے دیوانہ خرامی کو مری جانتی ہیں
ظلمتیں مجھ کو، مری چاپ سے پہچانتی ہیں
بول، اگر نُطق ہے، اے دیدۂ حیراں! تجھ میں
کتنے پُرہول شب و روز ہیں غلطاں تجھ میں
تو نے کیا کیا نہ اُٹھایا ہے، مری روحِ نیاز
تیز کرنوں کا غرور، اور کڑی دُھوپ کا ناز
کِس قدر شدّتِ سرما کے ہیں خنجر تجھ میں؟
جذب ہیں کتنی سِلیں برف کی، اے سر! تجھ میں؟

بول، ہوں زلف گزیدہ، دلِ حیراں کب سے؟
زہر کا کل ہے مرے خون میں غلطاں کب سے؟
کس قدر لُو کے تھپیڑے ہیں پرَ افشاں تجھ میں؟
کتنے طوفان ہیں، اے سینۂ سوزاں تجھ میں؟
دست و بازو میں ہیں بپھرے ہوئے دریا کیا کیا
اس کفِ پا میں ہیں تپتے ہوئے صحرا کیا کیا
سر میں ہیں، شورشِ کونین کے کس بل کتنے!
کم ہیں کانوں میں گرجتے ہوئے بادل کتنے!
برق و باراں سے ہوئیں دشت میں باتیں کیا کیا
غرق ہیں دل میں برستی ہوئی راتیں کیا کیا!
زندہ ہیں خون کے دریا میں نہانے والے
جا بھی اے سیلِ حوادث سے ڈرانے والے

پیرزنِ لیگ

کل رات کو کیا خواب تھا یہ حضرتؔ[1] آزاد
آغوش میں ظلمت کے ہے سہما سا اُجالا
سہمے سے اُجالے میں ہے اِک پیرزنِ تُند
اوڑھے ہوئے شبہائے جوانی کا دوشالا
یُوں گرمِ سخن ہے کہ جو اللہ نے چاہا
کردوں گی مَیں اسلام کی دُنیا میں اُجالا
اک بوند میں بہ جائے گی تعمیرِ دو عالم
چھلکے گا مرے صبر کا جس وقت پیالا
ہاں، لیگ ہوں، اسلام کی دیرینہ مجاہد
ہر بات مری تیغ ہے، ہر سانس ہے بھالا

[1] حکیم آزاد انصاری (مرحوم)

کافر کو جلاتی ہوں سرِ نارِ جہنّم
مومن کو عطا کرتی ہوں جنّت کا قبالا
آہی نہیں سکتا مِرے مُنہ "لالہ" بزدل
میں پاک، وہ ناپاک، میں گوری ہوں، وہ کالا
کیا اُس کا مرا ذکر، وہ دیسی، میں بدیشی
میں مصر کی مسجد، وہ بنارس کا شوالا
گنگا کی ہر اک لہر میں غلطیدہ ہے پستی
دجلے کی ہر اک موج میں رقصاں ہے ہمالا
کفّار کے دَل، اور مِرے چند سپاہی
اعدا کے پرے، اور مرا ایک رسالا
بھڑکوں تو ابھی سینۂ گیتی کو جلا دوں
گرجوں تو ابھی چرخ کو کر دوں تہ و بالا

ہر فردِ حکومت ہے مری آنکھ کا تارا
ہر "خان بہادر" ہے مری گود کا پالا

اِتنے میں اک انگریز نے اِک قصر کے در سے
آہستہ سے پٹ کھول کے سر اپنا نکالا

پیشانیٔ گلرنگ پہ کج افسرِ شاہی
آنکھوں میں فسوں، ہاتھ میں سونے کا نوالا

یہ دیکھتے ہی پیرزنِ لیگ یکایک
دَوڑی بڑی شفقت سے اُٹھاتے ہوئے مالا

مالے کو سنبھالتے ہی بہ اندازِ محبّت
چہرے پہ نظر گاڑ کے آنچل کو سنبھالا

اور کہنے لگی پیار سے لے لے کے بلائیں
"اے نورِ نظر! سلّمہ اللہ تعالےٰ![1]"

---

[1] ہر چند "سلّمکم اللہ" درست ہے مگر اُردو نے تصرف کر کے اِسے "سلّمہ اللہ" بنا دیا ہے - اور اب یہی صحیح ہے

ترانۂ آمد

لو، خمستاں میں جوش آپہونچا
گُل بکف، خُم بدوش آپہونچا

پھر اُٹھا شورِ نعرۂ صلوات
پھر وُہی بادہ نوش آپہونچا

اپنے اشعار کی جِلو میں لیے
صد نوائے سروش آپہونچا

جھومتا مثلِ ابرِ آزاری
با ہزاراں خروش آپہونچا

مردِ "امروز" — محو کرنے کو
غمِ "فرداد دوش" آپہونچا

تاجِ ہر کیش کے گرانے کو
باغیٔ سخت کوش آپہونچا

خوش ہو اے خفتگانِ خار بدل
شاعرِ گل فروش آپہونچا

مژدہ اے شاکیانِ عقل و ہوش
فاتحِ عقل و ہوش آپہونچا

پھر گھٹا میکدے پہ چھا جائے
کہدو رحمت سے جوش آپہونچا

خوفِ جہل

تیرگی سے نہیں کوئی ڈرتا
بلکہ اِس سے کہ اِس میں کیا ہوگا
دل کو ظلمت نہیں ڈراتی ہے
جہل سے رُوح تھرتھراتی ہے

فرطِ بُزدلی

جس طرح گریۂ مسرّت میں
لوگ فرطِ خوشی سے روتے ہیں
یونہیں کتنے بہادری کے کام
بزدلی کی مدد سے ہوتے ہیں

الوہیّت کا بیان

سخت حیراں ہوں کہ کیونکر جوشؔ اندازہ کروں
کیا تمنّا ہے مری، اور کون سی منزل میں ہے
آہ کس دانا سے پوچھوں بھید اس طوفان کا
یہ جو اِک طوفان میرے شہرِ آب و گِل میں ہے
گو بہ فیضِ عشق اب محسوس ہوتی ہے یہ بات
مشعلِ کون و مکاں گویا مری محفل میں ہے
پھر بھی مجھ کمبخت کو ملتا نہیں دم بھر فراغ
کس کو سمجھاؤں یہ جانِ زار کس مشکل میں ہے

کون سی حسرت ہے جو غلطاں ہے میرے قلب میں
کون سی لیلیٰ ہے جو مضطر مرے محمل میں ہے
اُف، الٰہ دہر بننے کی تمنا، الاماں
جو ازل کے روز سے پیچیدہ میرے دل میں ہے!

جلالِ محبوب

شب کہ یارِ دل نشیں، آتش فروزِ جنگ تھا
گنبدِ کونین دُودِ سوزِ غم سے تنگ تھا
ماہِ تاباں تھا کہ اک گرتی ہوئی آنسو کی بُوند
لالہ و گُل تھا کہ اِک اُڑتا ہوا سا رنگ تھا
ہو گئے تھے گوشہ ہائے دل میں گُم وہ ولولے
عرصۂ کون و مکاں جن ولولوں پر تنگ تھا
میرے دل کی لرزشیں تھیں اُسکے جلووں کا ثبات
میرے ماتھے کا پسینہ اُس کے رُخ پر رنگ تھا
الغرض یوں غیظ میں بکھری ہوئی تھی زلفِ ناز
جوشؔ سا شاہِ سخن بے افسر و اورنگ تھا

خُدا خیر کرے

مستِ صہبائے ترنّم ہُوں، خدا خیر کرے
آج پھر محوِ تبسّم ہوں، خدا خیر کرے
ہو نہ جاؤں کہیں تمکینِ مسلسل کا شکار
آج پھر غرقِ تلاطم ہوں، خدا خیر کرے
نالہ و آہ کی آواز مگر راہ میں ہے
رامش و رنگ میں پھر گُم ہُوں، خُدا خیر کرے
کہیں تا حشر نہ چھا جائے خموشی دل پر
اُن سے پھر گرمِ تکلّم ہوں، خدا خیر کرے
بن کے رہ جاؤں نہ اے جوش کہیں مثلِ سراب
آج پھر دُوکشِ قلزم ہوں، خُدا خیر کرے

شہریارِ گُل

میں شہریارِ گُل ہوں، شہنشاہِ لالہ ہوں
شکرِ خدا کہ غرقِ شرابِ دوسالہ ہوں

اب تک ازل سے جو کبھی خالی نہیں ہؤا
ساقی کے ہات کا وہ چھلکتا پیالہ ہوں

سُنتا ہے محتسب؟ کہ مرا نامۂ عمل
کہتا ہے مَیں بہشتِ بریں کا قبالہ ہوں

کب سے بہ شغلِ صیدِ نگارانِ تیزگام
وابستۂ رمیدگیٔ ہر غزالہ ہوں

اے جوشؔ اپنی دولتِ آغوش کی قسم
مَیں ماہتابِ حُسن و جوانی کا ہالہ ہوں

پشیمانی

جب یہ ظاہر ہے کہ انسان کی قدرت میں نہیں
گشتۂ زہد کو آسودۂ عصیاں ہونا
جب کہ ماحول و وراثت پہ ہے مبنی ہر فعل
بس میں تاریک ہی ہونا ہے، نہ تاباں ہونا
جب یہ ثابت ہے کہ انسان کے قبضے میں نہیں
بستۂ کفر کہ وابستۂ ایماں ہونا
جب کہ یہ جبرِ مشیّت ہے کہ بے حکمِ قضا
"آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا"
تو پھر از روئے خرد سب سے بڑا ہے یہ گناہ
کسی انساں کا گناہوں پہ پشیماں ہونا

نمازِ صبوحی

وفا شعار ہوں، ترکِ وفا نہیں کرتا
کبھی نمازِ صبوحی قضا نہیں کرتا

سوائے بادۂ دیرینۂ دبُتِ نوخیز
خُدا سے اور کوئی میں دُعا نہیں کرتا

جو نامُراد کہ کرتا نہیں گناہ کوئی
وہ حقِ حضرتِ آدمؑ ادا نہیں کرتا

جزائے خیر کا اِس بیخودی پہ طالب ہوں
کہ مَیں تصوّرِ یومِ جزا نہیں کرتا

ہزار بار کیا عہد، ترکِ صہبا کا
مگر تبسّمِ ساقی خطا نہیں کرتا

یہ خرابات ہے

یہ خرابات ہے تقوے کو نہیں بار یہاں
ہے تو بس پرسشِ رندانِ سیہ کار یہاں

ایک اِک حرف ہے اک دفترِ وحی و الہام
ایک اِک ذرّہ ہے آئینۂ اسرار یہاں

مصر میں حضرتِ یوسف کی خریداری تھی
خود جمالِ مہِ کنعاں ہے خریدار یہاں

یاں نواہی پہ ہے، پوشیدہ اوامر کا مدار
نقطۂ نور پہ ہے دائرہ نار یہاں

دنگ ہے شانِ رسولانِ بنی اسرائیل
الاماں، عزتِ رندانِ قدح خوار یہاں

آئیے

مہکے ہوئے ہوائے بہاراں میں آئیے
وقتِ سحر قریب ہے بستاں میں آئیے
بکھرا کے روئے تازہ پہ شب رنگ کاکلیں
نکہت سرائے سنبل و ریحاں میں آئیے
کلیوں کو ہے غرور، تو پھولوں کو ناز ہے
ہنستے ہوئے ذرا چمنستاں میں آئیے
ناشستہ عارضوں میں ہے رنگینیوں کی دھوم
اس گلستاں کے ساتھ گلستاں میں آئیے
واقف نہیں ہیں جوشؔ کے رتبے سے آپ ابھی
اک دن تو کوئے بادہ فروشاں میں آئیے

آجا

اے کہ تجھ بن دلِ بیمار تپاں ہے، آجا
اے مری دولتِ بیدار کہاں ہے، آجا
تاک میں عمرِ دوروزہ کے ہے بے مہرِ قضا
گھات میں فصلِ بہاراں کے خزاں ہے، آجا
اِن برستی ہوئی رنگین گھٹاؤں کے طفیل
ایک ہلچل سی سرِ آبِ رواں ہے، آجا
پھر طرب خیز ہے، معمورۂ عالم کی بہار
پھر جنوں خیز، حیاتِ گزراں ہے، آجا
اے مری پردہ نشینِ حرمِ ناز و نعیم
دیدۂ دل تری جانب نگراں ہے، آجا

فیضِ مے

کوئی موسم ہو — بہ فیضِ مئے سرجوش اے دِل
گُل تو گُل، خار بھی ہے شاہدِ گُل پوش اے دل

مجھ کو ہر سانس میں پھولوں کی مہک آتی ہے
ہر نفس کون ہے یہ زینتِ آغوش اے دِل

زندگانی پہ جہنّم کا گماں ہوتا ہے
ایک لمحے کو بھی آتا ہے اگر ہوش اے دل

رکھتے ہیں گوئے دو عالم کو خمِ چوگاں میں
مرحبا! ہمّتِ رندانِ بلا نوش اے دل

کون یہ مطربِ تمکیں ہے تری جنبش میں
اک نفس کو بھی جو ہوتا نہیں خاموش اے دل

تجھ سے

اے کہ فردوسِ جہانِ گزراں ہے تجھ سے
عشرتِ کارگہِ بزمِ جہاں ہے تجھ سے

صنمِ نادرہ گفتار و بُتِ سحر مقال
آہ و شیون پہ بھی نغموں کا گماں ہے تجھ سے

میری ہر جُنبشِ مژگاں سے ٹپکتی ہے شراب
گرمِ بازاریٔ رندانِ جہاں ہے تجھ سے

اے مرے شاہدِ شیرین و صبیح و گُل رنگ
بینشِ دیدۂ صاحب نظراں ہے تجھ سے

اے مرے سروِ خرامانِ لبِ ساحلِ گنگ
رونقِ پیچ و خمِ آبِ رواں ہے تجھ سے

ضدی پانی

نرم خو پانی کہ چھوتے ہی بصد شانِ نیاز
چھوڑ دیتا ہے جگہ اپنی، مگر اللہ رے ناز
دنگ ہو جاتا ہے اِس سے سنگِ آہن کا غرور
کیونکہ یہ اپنی جگہ پر آکے رہتا ہے ضرور
یہ وہ اک بہتی ہوئی ضد ہے بشانِ پیچ و تاب
پتھروں کے عزم ہو جاتے ہیں جس سے آب آب
پائے اِنسانی پہ جھک سکتی ہے لوہے کی جبیں
نرم پانی رام ہو جائے، یہ ممکن ہی نہیں

آہ شررؔ

اے شررؔ اے محرمِ دورِ گُل افشاں ہائے ہائے
اے مرے دیوانۂ آشفتہ ساماں ہائے ہائے
لکھنؤ کی وہ بہارِ غنچہ برکت وائے غم
آگرے کی وہ نسیمِ گُل بداماں ہائے ہائے
میرے جاں پرور رفیقِ غنچہ و گُل، آہ آہ
میرے دیرینہ انیسِ بادوباراں ہائے ہائے
کیوں دعا میری نہ پہونچی آہ تا بابِ قبول
مجھ کو تجھ سے کم نہ تھا مرنے کا ارماں ہائے ہائے

ضِدوں کا مجموعہ

ضدوں کا مجموعہ ہے یہ دُنیا، عجب یہاں کا معاملہ ہے
نگاہِ غائر سے دیکھئے تو فنا، بقا ہے۔ بقا، فنا ہے
کبھی ہیں نیکی میں شر کے پہلو، کبھی بدی میں ہے خیر و خوبی
کوئی بگڑ کر سنور رہا ہے، کوئی سنور کر بگڑ گیا ہے
کہیں شعاعیں ہیں اتنی مدھم، نگاہ گُم ہو کے رہ گئی ہے
کہیں چکا چوندھ کا یہ عالم، نظر کا رشتہ سلگ رہا ہے
کہیں مرض، عینِ تندرستی۔ کہیں ہے صحت مرض میں داخل
کہیں تجلی میں گتھیاں ہیں، کہیں سیاہی گرہ کُشا ہے

نعرۂ شاعر

میری نظر پہ عیاں، جلوۂ لوح و قلم
میرے سبو میں نہاں، چہرۂ لیل و نہار
میرا مذاقِ لطیف، ناظرِ سرو و سمن
میری نگاہِ طرب، ناقدِ ابرِ بہار
میرے ترانوں میں گم، جنبشِ بادِ شمال
میرے پیالے میں غرق، ابرِ سرِ کوہسار
میری طرب گاہ میں، حلقۂ بیرونِ در
شیخِ نفس باختہ، صوفیِ ناقص عیار

رُباعیات

(۱)

مہمل ہے مرے لئے نصابِ زر و سیم
حاصل ہے مجھے سلطنتِ عقلِ سلیم
رکھتی ہے نگاہوں میں جو آفاق وجہات
میری ہستی ہے، وہ رسدگاہِ عظیم

(۲)

اپنی خلوت سرا میں جاؤں کیونکر
خود کو اپنی جھلک دکھاؤں کیونکر
ہے سب سے بڑا فاصلہ قربِ کامل
اپنی ہستی کا بھید پاؤں کیونکر

(۳)

افسوس کہ محدود ہے عرفاں تیرا
قطرے کی گرفت میں ہے طوفاں تیرا
تو خود کو سمجھ رہا ہے جزوِ عالم
عالم تو خود اک جزو ہے ناداں تیرا

(۴)

حق کا کوئی پابند نہیں ہے واللہ
حق سے کوئی خورسند نہیں ہے واللہ
اخلاص و شرافت کو ہے جس شخص پہ ناز
آدمؑ کا وہ فرزند نہیں ہے واللہ

(۵)

حق کو ہو فروغ، ہر ولی چاہتا ہے
باطل مٹ جائے، ہر نبی چاہتا ہے
لیکن یہ بزرگوار جو چاہتے ہیں
کیا قادرِ مطلق بھی وہی چاہتا ہے

(۶)

اپنی ہی غرض سے جی رہے ہیں جو لوگ
اپنی ہی عبائیں سی رہے ہیں جو لوگ
اُن کو بھی ہے کیا شراب پینے سے گریز؟
انسان کا خون پی رہے ہیں جو لوگ

(۷)

خود کو گم کردہ راہ کر کے چھوڑا
حوّا کو بھی تباہ کر کے چھوڑا
کیا کیا نہ کیے "خدا" نے جنت میں جتن
آدم نے مگر گناہ کر کے چھوڑا

(۸)

کیا پھر یہی کھونا، یہی پانا ہوگا؟
پھر نازِ خرد دل کو اٹھانا ہوگا؟
سنتے ہیں کہ اے بیخودیِ کُنجِ لحد
پھر حشر کے دن ہوش میں آنا ہوگا!

(۹)

اے جذبۂ سیل، قعرِ دریا سے نکل
اے رُوحِ بہار، دامِ صحرا سے نکل
اے رازِ ازل، نقاب چہرے سے اُٹھا
اے بنتِ عِنَب، خلوتِ مینا سے نکل

(۱۰)

بُت ساز ہے توقیر کے قابل، مانا
لیکن اُس کو مرے برابر نہ بٹھا
پتھر کو تراش کر بناتا ہے وہ "بت"
میں بُت کو تراش کر بناتا ہوں "خدا"

(۱۱)

دم میں مہِ نو کو بدر کرتی ہے شراب
اربابِ نظر کی قدر کرتی ہے شراب
سو سال میں ارتقا سے کھلتی ہے گرہ
اک آن میں شرحِ صدر کرتی ہے شراب

(۱۲)

غم ہو تو شراب و چنگ و ساقی، سب ہیچ
طنبورۂ ہندی و عراقی سب، ہیچ
اس کارگہِ دہر میں دم بھر کے لئے
مقصد ہے فقط نشاط، باقی سب ہیچ

(۱۳)

ہم سایۂ ظلمت میں بھی تابندہ رہے
تابندہ و پائندہ و رخشندہ رہے
اس موت کی ہلچل میں ہمارے مانند
یہ کس کی مجال ہے کہ یوں زندہ رہے

(۱۴)

افسوس یہ وہم کامرانی تیرا
یاروں سے یہ ذوقِ خوش گمانی تیرا
حالانکہ وہی سب سے بڑا دوست ہے آج
جو شخص نہیں دشمنِ جانی تیرا

(۱۵)

واقف بھی ہے، آئینِ تعمق کیا ہے؟
دستورِ تناسب و تطابق کیا ہے؟
اسلام کا "شاہ نامہ" لکھنے والے
اسلام کو شاہی سے تعلق کیا ہے

(۱۶)

تقدیر کی یہ دروغ بافی، افسوس
برتاؤ یہ رحمت کے منافی، افسوس
فاقے کا شکار ہیں کروڑوں بندے
"اللہ" کی یہ وعدہ خلافی، افسوس

(۱۷)

مہتاب کی ضَو سے گلستاں ہے شیریں
پہلو میں مچل رہا ہے اِک زہرہ جبیں
کرسی سے یہ راق لے کے آیا ہے یہ کون؟
کہدو کہ پلٹ جائیے، مجھے وقت نہیں!

(۱۸)

عالَمِ محرومِ جاہ کر دے گا تجھے
صیدِ غمِ بے پناہ کر دیگا تجھے
اے جھُوٹ کے فائدوں کے مُنکر انساں
سچ بول، کہ سچ تباہ کر دیگا تجھے

(۱۹)

عقبیٰ بھی اک فریب ہے، دُنیا بھی فریب
قطرہ بھی اک فریب ہے، دریا بھی فریب
یہ کارگہِ فریب، توبہ، توبہ
اللہ بھی ہے فریب، بندہ بھی فریب

(۲۰)

آغاز ہی آغاز ہے، اور کچھ بھی نہیں
انجام بس اک راز ہے، اور کچھ بھی نہیں
کہتی ہے جسے نغمۂ شادی دُنیا
اک کرب کی آواز ہے، اور کچھ بھی نہیں

(۲۱)

پروردۂ شیون ہے تکلّم میرا
فریاد کی اک لے ہے ترنّم میرا
مانیگا اسے کون کہ ہوتا ہے طلوع
آنسو کے افق سے ہر تبسّم میرا

(۲۲)

زخمِ تحقیق، دِل پہ کھائے ہوئے آؤ
نورِ مطلق سے لَو لگائے ہوئے آؤ
مُڑ مُڑ کے میں ہر بار نہیں دیکھونگا
اے شمس و قمر، قدم بڑھائے ہوئے آؤ

(۲۳)

یا دل کو رہِ کرب میں کھو دیتا ہوں
یا جوئے ظرافت میں ڈبو دیتا ہوں
آئینِ حیات و موت، توبہ، توبہ
ہنستا ہوں کبھی، اور کبھی رو دیتا ہوں

(۲۴)

ساقی، تاخیر کا نہیں ہے یہ محل
مستوں کی طرح جھوم رہے ہیں بادل
دے جنّتِ آبگینہ، یعنی ساغر
لا کعبۂ سر بہ مُہر یعنی بوتل

(۲۵)

ہندو ہوں، نہ اے جوشؔ مسلماں ہوں میں
عدو شکر نہ ظلمت ہوں، نہ طوفاں ہوں میں
آب و گِلِ ہند سے ہوں، اور ہندی ہوں
نسلِ آدمؑ سے ہوں، اور انساں ہوں میں

(۲۶)

واللہ کہ بے علم و تُنک سر ہیں وہ لوگ
اسلام کے دائرے سے باہر ہیں وہ لوگ
دُنیا میں ہے نفعِ مے سے جن کو انکار
از روئے کلامِ پاک کافر ہیں وہ لوگ

(۲۷)

عقلوں سے جُدا، غلاف کرتا ہُوں میں
ذہنِ اِنساں کو صاف کرتا ہُوں میں
کیا مجھ کو پکارتا ہے کعبے کی طرف
ہر سانس میں سَو طواف کرتا ہوں میں

(۲۸)

اکثر انعام — قہر بن جاتا ہے
یہ بحر — کثیف نہر بن جاتا ہے
وہ علم کہ اکسیر ہے اِنساں کے لئے
گر ہضم نہ ہو، تو زہر بن جاتا ہے

(۲۹)

اِک عمر میں ہوتی ہے بصیرت پیدا
کرتا ہے خدا شاذ یہ دولت پیدا
رگ رگ میں تفکّر نہ اتر جائے اگر
خود علم سے ہوتی ہے جہالت پیدا

(۳۰)

جُز عقل کوئی دوا نہیں ہے واللہ
جُز فکر کوئی غذا نہیں ہے واللہ
کاندھے پہ عُلوم کے جو رہتا ہے سوار
اُس جہل کی انتہا نہیں ہے واللہ

(۳۱)

قدرت، انساں سے برسرِ جنگ نہیں
میدانِ عمل وسیع ہے، تنگ نہیں
شاید اِن شاکیانِ دوراں کا مزاج
قدرت کے مصالح سے ہم آہنگ نہیں

(۳۲)

بی اے بھی مۓ جہلِ مرکب سے ہیں مست
دینی علماء، سو وہ بھی ناکارہ و پست
نزدِ اربابِ عقل اِن دونوں میں
"فرقِ خرِ عیسیٰ و خرِ دجّال است"

(۳۳)

صد شکر کہ آ گئے شہابی جاڑے
کلیوں میں بسے ہوتے حبابی جاڑے
ہلکی پھلکی رعنائیوں کے قابل
شیریں، نورس، خنک، گلابی جاڑے

(۳۴)

مکھڑے میں لئے ہوئے کچھ افسانے سے
آنکھوں میں چھلکتے ہوئے پیمانے سے
جس طرح اُڑے سینۂ گل سے خوشبو
یُوں صبح کو نکلا کوئی بُت خانے سے

(۳۵)

اِس زہد پہ اور پیروِ باطل ہونا
اس علم کے باوجود جاہل ہونا
حوروں کا تجھے خلد میں ملنا اے شیخ
شیطاں پہ ہے قرآن کا نازل ہونا

(۳۶)

یہ عمرِ دو روزہ کہ ہے مانندِ سراب
اک خندۂ غم ہے، اِک سکونِ بیتاب
یا سایہ ہے یہ میانِ ہستی و عدم
یا وہم ہے اک میانِ بیداری و خواب

(۳۸)

تسبیح، وفورِ کاہلی ہے دراصل
یہ شیشہ نہیں، ظرف گِلی ہے دراصل
کرتا نہیں جس کے باعث اِنسان گناہ
وہ زہد نہیں ہے، بُزدلی دراصل

(۳۹)

کھُلتا نہیں بھید، زندگانی کیا ہے
یہ پیریؔ و طفلی و جوانی کیا ہے
اک حادثہ؟ اتفاق؟ یا اک صنعت؟
معلوم نہیں حیاتِ فانی کیا ہے

(۳۹)

کچھ شغل نہیں یہاں ابھرنے کے سوا
جی میں جو آئے، کر گزرنے کے سوا
دیکھا تو کوئی چیز نہیں ہے پر ہول
دُنیا میں کسی چیز سے ڈرنے کے سوا

(۴۰)

یوں عُقدہ کھلا، کسی پہ کھولا نہ گیا
اسرار کو ناطقے پہ تولا نہ گیا
معلوم ہوا راز تو چھیڑیں بحثیں
محسوس ہوا راز تو بولا نہ گیا

(۴۱)

برتیگا نہ کوئی آدمیّت تجھ سے
اِک فرد کریگا نہ محبّت تجھ سے
تکرار سے دردِ دل سنانے والے
احباب کو ہو جائیگی نفرت تجھ سے

(۴۲)

تو کیوں مرے ہجر میں گھُلی جاتی ہے
کُڑھتی ہے، کراہتی ہے، گھبراتی ہے
فریاد کہ اپنے دل سے راتوں کو مجھے
اکثر ترے رونے کی صدا آتی ہے

(۴۳)

معنی کی تب و تاب گھٹاتا ہوں میں
جب حلقۂ الفاظ میں لاتا ہوں میں
صد حیف کہ پگھلے ہوئے سونے کو ندیم
تانبے کی زمین پر بہاتا ہوں میں

(۴۴)

مجھ سے مری فطرت کا تقاضا کیا ہے؟
کھلتا نہیں بھید یہ معمّا کیا ہے؟
آغوش میں تم ہو، پھر بھی دل ہے بیچین
معلوم نہیں مری تمنّا کیا ہے؟

(۴۵)

بدلا نہیں صہبا میں یہ انگور ہنوز
یہ شمع نہیں ہوئی ہے پُر نُور ہنوز
شاعر تو ہے اوروں کے زمانے سے قریب
شاعر کا زمانہ ہے مگر دُور ہنوز

(۴۶)

"حال" آنکھ سے مستُور ہوا جاتا ہے
مُنہ وقت کا بے نُور ہوا جاتا ہے
جو دُور تھا آ رہا ہے میرے نزدیک
نزدیک جو ہے، دُور ہوا جاتا ہے

(۴۷)

اے شاعرِ دانا، خس و خاشاک نہ بن
اکسیر ہے تُو، سر نہ جُھکا، خاک نہ بن
آئندہ زمانے کی امانت! ہشیار
اُٹھ لمحۂ موجود کی خوراک نہ بن

(۴۸)

دل کا عالم ہے برتر از وہم و گماں
آئینِ ریاضی کا نہیں نام و نشاں
دو دو جو ملیں تو "چار" کہتا ہے حساب
دو دو جو ملیں تو "ایک" ہوتے ہیں یہاں

(۴۹)

میکش کا سرِ در کج کلاہی بہتر؟
یا شیخ کا کبرِ حق پناہی بہتر؟
طاعت بہ ریائے بادہ نوشی بہ خلوص
دونوں میں ہے کون شئے الٰہی بہتر؟

(۵۰)

ہر سانس میں زلفِ جاں سنور جاتی ہے
ہر آن رگِ فکر ابھر جاتی ہے
پڑھتا ہوں نوشتہ ہائے دستِ قدرت
جس سمت بھی اے جوشؔ نظر جاتی ہے

(۵۱)

ہستی و عدم کی انجمن ہے مجھ میں
کیا ذکرِ چمن، روحِ چمن ہے مجھ میں
قرنوں سے رواں ہے جو رگِ عالم میں
وہ خونِ حیات موجزن ہے مجھ میں

(۵۲)

اللہ اگر نہیں فقط وہم و قیاس
لازم ہے کہ ہو رحمتِ کامل پئے ناس
واللہ یہ خوفِ نار و بیمِ دوزخ
اک بیوہ تخیّل ہے، اک آوارہ ہراس

(۵۳)

اے پیرِ خرابات کے اصحابِ کرام
اے دہر کے نوریانِ حنا کی اجسام
ہاں شاہدِ قدرت کی طرف سے تم پر
تا حشر لگاتار درود اور سلام

(۵۴)

بستر پہ ہے، رسمسا رہا ہے کوئی
انوارِ سحر پہ چھا رہا ہے کوئی
کھڑے میں برس رہے ہیں موتی گویا
یوں چونک کے مسکرا رہا ہے کوئی

(۵۵)

عیّار کی بھی عجیب قسمت ہے ندیم
جب دیکھئے مبتلائے آفت ہے ندیم
دانش سے ملا نہ رشتۂ عیّاری کا
یہ تو اک تیز رو حماقت ہے ندیم

(۵۶)

مفقود ہے رسم و راہِ الفت ساقی
اگلی سی کہاں وہ آدمیّت ساقی
دے بادہ کہ اس عصرِ ہوس پرور میں
ہم لوگ بھی ہیں بہت غنیمت ساقی

(۵۷)

تم دور ہو، کس طور سے بلواؤں تمہیں
کون ایسا جتن کروں کہ پا جاؤں تمہیں
بادل میں گرج ہے اور ہوائیں پُرشور
ایسے میں کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں تمہیں

(۵۸)

برسات کے آخری ہیں جھالے، یارب
یہ ابر کہیں بھون نہ ڈالے، یارب
آغوش میں یا اُن کو بٹھا دے لاکر
یا جوشؔ کو دنیا سے اٹھا لے، یارب

(٥٩)

خنکی سے ہے بادِ صبح بوجھل ساقی
کہرے سے دھواں دھواں ہے جنگل ساقی
کانٹے ہوں کہ پھول سب ہیں دھندلے دھندلے
بوتل، ہاں جلد کھول بوتل ساقی

(٦٠)

واماندہ و ناصبور رہتا ہوں مَیں
بے شائبۂ شعور رہتا ہوں میں
فریاد ہے اے شدّتِ قربِ کامل
اپنے سے ہمیشہ دور رہتا ہوں میں

(۶۱)

ہم رہتے ہیں تشنہ، چھلک کے پینے کیلئے
گرداب میں پھنستے ہیں سفینے کے لئے
جیتے ہیں، تو مرنے کے لئے جیتے ہیں
مرتے ہیں تو بے دریغ جینے کے لئے

(۶۲)

سیلاب، زمیں ہے — آسماں ہے طوفان
آندھی کی طرح رواں دواں ہے طوفان
ہستی کا سفر ہے، اور شب ہے تاریک
کشتی ہے بھنور، تو بادباں ہے طوفان

(۶۳)

بیدار، کہ ہے وقتِ صبُوح اے ساقی
دِل، جسم ہے — اور بادہ ہے رُوح اے ساقی
اِس سیلِ حوادث میں، مئے رنگیں کا
ہر قطرہ ہے، صد کشتیٔ نُوح اے ساقی

(۶۴)

جب قافلہ آنسوؤں کا ہوتا ہے رواں
اللہ رے پیچ و تابِ سوزِ پنہاں
یُوں دل سے نکلتا ہے دمِ گریہ بخار
جس طرح برستے ہوئے پانی میں دھواں

(۶۵)

کچھ بھی نہیں دُنیا میں سوائے دُنیا
کھنا نہ پڑے قبر میں "ہائے دُنیا"
دُنیا کے مزے اٹھا لے او خانہ خراب
قبل اِس کے تری لاش اٹھائے دُنیا

(۶۶)

پَیروں میں سکت نہیں ہے اور راہ طویل
جادے کا نشان ہے، نہ آوازِ دلیل[1]
دے جام کہ اے ساقیِ دانا، مجھ کو
اسمار کا فقط علم ہے، اور وہ بھی قلیل

[1] راہ نما

(۶۷)

اے بارِ خدا! جان چکا ہوں تجھ کو
جانا ہی نہیں، مان چکا ہوں تجھ کو
پھر کیوں ہے مرے فسخِ عزائم[1] پہ مصر
کہتا ہوں کہ پہچان چکا ہوں تجھ کو

(۶۸)

برسات کا حبس ہے، چمن ہے بیہوش
شاخوں میں لچک ہے، نہ ہواؤں میں خروش
آپس میں ہے بات چیت گویا موقوف
اِس طرح کھڑے ہوئے ہیں پودے خاموش

[1] ایک معروف حدیث کی طرف اشارہ ہے

(۶۹)

ساقی، نہ یہ پوچھ دورِ ساغر کب تک
ہاں، دَورِ چلے جائیے، نہ روکوں کب تک
صد شکر کہ میں نہیں "خدا" سے مایوس
اور مجھ سے خدا بھی نہیں مایوس اب تک

(۷۰)

کاکُل، کھُل کر بکھر رہی ہے گویا
زمیں سے ندی گزر رہی ہے گویا
آنکھیں تری جھُک رہی ہیں مجھ سے مل کر
دیوار سے دھوپ اُتر رہی ہے گویا

(۷۱)

مَیداں میں برستا ہُوا پانی تادُور
آڑی، ترچھی ہوائیں مست و مخمور
اِس بارشِ کیف میں مُبارک اے جوشؔ
یہ کیف سے شرابور، یہ مستی بھرپور

(۷۲)

یہ برق کا پیچ و تاب، باراں کا یہ زور
یہ گونج، گرج، یہ گھڑگھڑاہٹ، یہ شور
صد شکر، کہ آج زیرِ موجِ باراں
نشّہ ہے گھٹا ٹوپ، شرابیں گھنگھور

(۷۳)

حق کو نہ اِن اربابِ یقیں سے پوچھو
صوفی سے، نہ شیخِ درس و دیں سے پوچھو
برداشت کی طاقت ہو، تو اسرارِ حیات
رندانِ خرابات نشیں سے پوچھو

(۷۴)

رندانِ خرابات نشیں کی آواز
واللہ کہ ہے عرشِ بریں کی آواز
صہبا میں ہیں بحرِ معرفت کی موجیں
قلقل میں ہے جبریلؑ امیں کی آواز

(۷۵)

فاقوں سے ہے "اللہ" کی مخلوق تباہ
راتیں ہی نہیں، خیر سے دن بھی ہیں سیاہ
اِس مرحمتِ عام کے باوصف اے جوشؔ
بکتا ہے، کہ رزّاق نہیں ہے اللہ!

(۷۶)

پوری دل کی ہو بات، ممکن ہی نہیں
ہو ختم کبھی یہ رات، ممکن ہی نہیں
وہ دَورِ حیات ہو کہ مابعدِ حیات
ہستی سے مگر نجات، ممکن ہی نہیں

(۷۷)

کہتے ہو کہ منہ آنسوؤں سے تر نہ کروں؟
غم ٹھوس حقیقت ہے، یہ باور نہ کروں؟
بیکار ہے ہائے ہائے کرنا، لیکن
انسان ہوں ہائے ہائے کیونکر نہ کروں؟

(۷۸)

پہلو میں مرے، دیدۂ پُر نم ہے کہ دل
معبُود! یہ مقیاسِ تپِ غم ہے کہ دل
ہو ذرّہ بھی کج تو بال پڑ جاتا ہے
یہ شیشۂ ناموسِ دو عالم ہے کہ دل

(۷۹)

اللہ رے ایماں کا مرے استحکام
اِک ہات میں ہے حبلِ متیں، ایک میں جام
دِل برزخِ بحرین ہے گویا اے جوشؔ
اک سمت ہے کفر، ایک جانب اسلام

(۸۰)

دے جام کہ ہوتا ہے سویرا ساقی
مشہور ہے اعتدال میرا ساقی
وہ غیبتِ نُور ہو کہ طغیانیٔ نُور
دونوں کا نتیجہ ہے اندھیرا ساقی

(۸۱)

آئین کچھ اور، حکمِ فطرت کچھ اور
قانون کچھ اور، آدمیّت کچھ اور
اللہ کا قول و فعل اتنا متضاد!
احکام کچھ اور ہیں، مشیّت کچھ اور

(۸۲)

اے شدّتِ زندگی سے مرنے والو
روتے ہوئے دنیا سے گزرنے والو
جھونکوں میں کراہنے کی آوازیں ہیں
تم کون ہو ہائے ہائے کرنے والو؟

(۸۳)

وہ خالقِ جاں، کہ دل مسل دیتا ہے
بندوں کے ارادوں کو کچل دیتا ہے
دیتا نہیں دانا کو عمل کی توفیق
نادان کو تکلیفِ عمل دیتا ہے

(۸۴)

زاہد رہِ معرفت دکھا دے مجھ کو
یہ کس نے کہا ہے کہ سزا دے مجھ کو
کافر ہوں؟ ہوئی یہ تو مرض کی تشخیص
اب اِس کا علاج بھی بتا دے مجھ کو

کتبہ: محمد یعقوب عباسی - جون ۴۴ء